اور جس طرح دانہ دانہ چن کر یہ خرمن جمع کیا ہے، اس کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، کتاب کے شروع میں مؤلف کے قلم سے ایک مقدمہ ہے، جس میں تذکرہ کی ترتیب کے متعلق ضروری باتیں درج ہیں، مگر اس میں فہرستِ مآخذ اور اسماء و اعلام وغیرہ کا انڈکس نہیں ہے، غالباً آخری حصہ میں تمام حصوں کا ایک ساتھ ہوگا، یہ دونوں تذکرے شاہ ایران محمد رضا پہلوی کے جشن تاجپوشی کی یادگار میں شائع ہوئے ہیں۔

مبادیاتِ تحقیق عبدالرزاق صاحب قریشی، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۰۶ صفحات کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت چار روپئے ۵۰ پیسے۔ پتہ: ادبی پبلشرز، ۳۵ شیفر روڈ۔ بمبئی ۸

علمی تحقیقات (Resurch) ایک مستقل فن بن گیا ہے، یورپین زبانوں میں اس پر مستقل کتابیں ہیں، اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں تھی، لائق مصنف نے یہ کتاب لکھکر اس کمی کو پورا کیا ہے، وہ خود کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ انجمن اسلام بمبئی میں پی، ایچ، ڈی کے طلبہ کی رہنمائی بھی کرتے ہیں، اس لیے انکو تحقیق کے اصولوں سے بھی پوری واقفیت ہے، اور اس کا ان کو عملی تجربہ بھی ہے، یہ کتاب ان کے علم اور عملی تجربات کا نچوڑ ہے، اس میں انھوں نے تحقیق کے اصول و کلیات سے لے کر اس کے جزئیات اور ماخذوں کی تلاش و تحقیق، ان سے استفادہ کے طریقے سے لے کر مقالہ کی تسوید تک کے لیے مفصل ہدایات اور ضروری معلومات مختلف عنوانات کے ماتحت جمع و مرتب کر دیے ہیں، اس لحاظ سے اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے اور وہ ریسرچ اسکالرس کے لیے بہترین گائڈ کا کام دے سکتی ہے۔

"م"

جلد ۱۰۲ ماہ جمادی الاول ۱۳۸۸ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۸ء عدد ۲

مضامین

شذرات

یہ واقعہ حیرت انگیز ہے کہ الجمعیۃ اخبار اور اسکے اڈیٹر مولوی محمد عثمان فارقلیط صاحب پر مختلف فرقوں کے درمیان منافرت پھیلانے کے الزام میں مقدمہ قائم کیا گیا ہے، جمعیۃ العلماء کی تاریخ قوم پروری اور وطن دوستی کے کارناموں سے معمور ہے، اس نے ملک کو قوم پروری اور ہندو مسلم اتحاد کا سبق پڑھایا ہے اور اس زمانہ میں ہندستان کی آزادی کا علم بلند کیا ہے اور اس کے لیے قربانیاں کی ہیں جب موجودہ قوم پرور اسکا نام بھی نہیں جانتے تھے بلکہ بہت سے پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، اس لیے اخبار الجمعیۃ کو جو جمعیۃ العلماء کا نقیب ہے، فرقہ پرور اخبارات میں شامل کرنا سخت حیرت انگیز ہے، اس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی حق تلفی اور ان کی مظلومیت اور فرقہ پرور جماعتوں کی مسلم دشمنی پر لکھتا اور حکومت کو انکی جانب توجہ دلاتا رہتا ہے، الجمعیۃ کی جن تحریروں کو حکومت فرقہ پروری سمجھتی ہے وہ درحقیقت فرقہ پروروں کی دل آزار تحریروں کا جواب ہے اس نے خود کبھی ابتدا نہیں کی اور اس جواب کا تو بہر حال اس کو حق حاصل ہے۔

لیکن یہ کوئی جرم نہیں بلکہ حکومت اور ملک کی بہت بڑی خدمت ہے کہ اسکو صحیح معنوں میں سیکولر اور جمہوری بنانے کی کوشش کیجائے جسمیں ہندستان کے تمام شہریوں کے حقوق برابر اور انکو یکساں ترقی کے مواقع حاصل ہوں کسی فرقہ کے ساتھ مذہب کے اختلاف کی بنا پر کوئی امتیاز نہ برتا جائے اور کوئی فرقہ محض اکثریت کی بنا پر کسی اقلیت پر ظلم و زیادتی نہ کرنے پائے، اس سے انکار نہیں کہ مرکزی حکومت سب فرقوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتی ہے، اکثریت کا معقول اور سنجیدہ طبقہ بھی کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی پسند نہیں کرتا لیکن فرقہ پرور جماعتوں کا اسقدر غلبہ ہو گیا ہے کہ انکے سامنے کسی کی چلنے نہیں پاتی اور اب قوم پروری نام ہو گیا ہے ان ہی کی خواہشات کی ہمنوائی کا، اسکے علاوہ جو کچھ ہے

سب فرقہ پروری ہے، حتی کہ اقلیت کی جانب سے اپنی مظلومیت کا اظہار بھی جرم ہے۔

~~~~~~~~

اتحاد و یکجہتی کا یہ مفہوم بھی خوب ہے کہ اسکی زد سب سے پہلے ان ہی اخبارات پر پڑی جو فرقہ پروری کے سب سے بڑے مخالف اور اتحاد و یکجہتی کے سب سے بڑے علمبردار ہیں، لطف یہ ہے کہ جو اخبارات علانیہ اسکے دشمن ہیں اور فرقہ پروری اور مسلم دشمنی کا زہر برابر پھیلاتے رہتے ہیں اُن سے کوئی باز پرس نہیں، اس سے اتحاد و یکجہتی کے مفہوم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس سے جمعیۃ العلماء کو سبق لینا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اب قوم پروری کا پرانا مفہوم بدل گیا ہے، اس لیے اس کو بھی اپنی قوم پروری پر نظر ثانی کرنا چاہیے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اخبار الجمعیۃ اور اسکے ترجمان حقیقت اڈیٹر کو اس آزمائش میں کامیاب فرمائے اور ہر قسم کی مشکلات و مصائب سے محفوظ رکھے۔

~~~~~~~~

یہ مسلّم ہے کہ فرقہ پرور جماعتوں کا خاص نشانہ مسلمان ہیں، اور انکی فتنہ انگیزی سے سب سے زیادہ نقصان ان ہی کو پہنچتا ہے، اس لیے ان سے زیادہ فرقہ پروری کا مخالف اور اتحاد و یکجہتی کا حامی کون ہوگا، مسلمان تو فرقہ پروری کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، یہ کون عقل باور کر سکتی ہے کہ وہ جان بوجھکر اپنے کو تباہ و برباد کرنا پسند کریں گے، لیکن قوم پروری اور اتحاد و یکجہتی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ایک جمہوری حکومت کے سامنے اپنی شکایتیں بھی بیان نہ کریں، اپنے حقوق بھی نہ مانگیں اور فرقہ پرستوں کے ہر ظلم و زیادتی کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے رہیں، اور اپنے کو انکی مرضی کے تابع اور اکثریت میں ضم کر دیں، اتحاد و یکجہتی جبر و قوت سے نہیں بلکہ دلجوئی اور حسن سلوک سے پیدا ہوتی ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی ان شکایتوں کو جن کا اعتراف اکثریت کے دانشوروں اور حکومت کے منصف مزاج ارکان تک کو ہے، دور کیا جائے، ان کو وہ حقوق دیے جائیں جو ہندستان کے دستور کی رو سے انکو حاصل ہیں، فرقہ پرور جماعتوں کو مسلم دشمنی سے روکا جائے، مسلمان تو صرف عزت و آبرو کی زندگی چاہتا ہے، اور فرقہ پرور جماعتیں اس کو اچھوت بنا کر رکھنا چاہتی ہیں۔

ان کے لیڈر اس کا علانیہ اظہار بھی کرتے رہتے ہیں، سارا جھگڑا اسی کا ہے، اس لیے اتحاد و یکجہتی کی اصل دشمن تو یہ جماعتیں ہیں، مگر ان پر کسی کا بس نہیں چلتا اور سارا نزلہ عضو ضعیف پر گرتا ہے۔

ادھر چند برسوں کے اندر مصر سے طبقات و تراجم کی بعض اہم اور نادر کتابیں شائع ہوئی ہیں، اُن میں ایک کتاب ساتویں صدی کے نامور عالم کمال الدین عبد الرزاق بن تاج الدین احمد شیبانی المعروف بابن الفوطی المتوفی ۷۲۳ھ کی "مجمع الآداب فی معجم الالقاب" ہے، مصنف مختلف فنون کے جامع تھے، مگر تاریخ اور طبقات انکا خاص فن تھا، اس پر انھوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں مذکورۂ بالا کتاب بھی ہے، جو کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں تاریخ اسلام کے ہر طبقہ کے اصحاب علم و کمال اور نامور اشخاص کا تذکرہ ہے، آج سے ۳۰ - ۳۵ سال پہلے اسکے بعض اجزا جو ف، ل اور م کے القاب پر مشتمل ہیں، اورنٹیل کالج میگزین لاہور میں بالاقساط شائع ہوئے تھے، بعد میں انکو کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا تھا، ادھر چند سال سے مصر کے ایک فاضل ڈاکٹر مصطفیٰ جواد کی تصحیح و تہذیب کے ساتھ مصر سے اس کی اشاعت شروع ہوئی ہے، اسکی چار جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں، چوتھی جلد ۶۶ء میں شائع ہوئی تھی مگر ہمارے پاس چند مہینے ہوئے آئی ہے، یہ ف اور ن کے القاب پر مشتمل ہے، یہ طبقات کی بڑی جامع تصنیف ہے جس میں ہر طبقہ کے اصحاب کمال کا ذکر ملتا ہے، اسکی اشاعت سے طبقات و تراجم میں ایک اہم کتاب کا اضافہ ہوا ہے۔

دوسری کتاب تیسری صدی کے ایک نامور محدث ابو عمرو خلیفہ بن الخیاط المتوفی ۲۴۰ھ کی کتاب الطبقات ہے، مصنف صاحب طبقات کبیر محمد بن سعد کاتب الواقدی کے ہم عصر تھے، اسلیے یہ کتاب طبقات کی قدیم ترین کتابوں میں ہے، مصر کے ایک فاضل سہیل زکار نے اسکو ایڈٹ کیا ہے، ابھی اسکی پہلی جلد شائع ہوئی ہے، اس میں اصحاب تراجم کے حالات بہت مختصر ہیں، عام طور پر صرف نام و نسب اور سنہ وفات کا ذکر ہے، بعض تراجم میں کچھ حالات بھی دیدیے ہیں، لیکن اپنی قدامت کے لحاظ سے بہت اہم ہے

مقالات

ابن الفارض

از جناب ڈاکٹر حافظ غلام مصطفیٰ صاحب

(۳)

آثار و باقیات شیخ ابن الفارض کی شاعری کا تمامتر سرمایہ جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے، وہ چند قصائد و قطعات اور کچھ رباعیات و الغاز پر مشتمل ہے، ان کا دیوان کسی نہ کسی شکل میں ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا اور کم از کم اس کا ایک نسخہ شیخ نے خود اپنے ہاتھ سے تحریر کیا تھا، اور متعدد نسخے لوگوں کے پاس موجود تھے، کیونکہ شیخ کے قصائد کو بہت جلد قبول عام حاصل ہو گیا تھا، اور وہ ادبی مجلسوں میں عام طور پر اور سماع کی محفلوں میں خاص طور پر پڑھے جاتے تھے، لیکن مختلف نسخوں میں قصائد کی تعداد و ترتیب مختلف تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس کو جو پسند آجاتا تھا اپنے ذوق کے مطابق اسکو لکھ لیتا تھا،

دیوان کی باقاعدہ ترتیب و تدوین کا کام سب سے پہلے شیخ کی وفات کے تقریباً سو سال کے بعد ان کے نواسے شیخ علیؒ نے انجام دیا، شیخ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ انکی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے کمال الدین محمد کو ملا، کمال الدین محمد کے پاس ان کا اپنا ایک نسخہ بھی تھا، انھوں نے اس کا مقابلہ شیخ کے نسخے سے کر لیا، اس طرح ان کے پاس دو صحیح

۱؎ تفصیل کے لیے دیکھئے مقدمہ شرح دیوان، ص ۱۳ - ۱۴

نسخے ہو گئے، لیکن شیخ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ کچھ عرصہ کے بعد ان کے ہاتھ سے نکل گیا، اس کو شیخ الشیوخ کے صاحبزادے نے ان سے عاریۃً لیا تھا اور پھر واپس نہ کیا، اور کمال الدین محمد کے پاس صرف ان کا اپنا نسخہ رہ گیا، اور پھر یہی نسخہ ان کے بھانجے شیخ علی مذکور کو ملا جو آخر تک ان ہی کے پاس رہا،

شیخ علی کے زمانہ میں دیوان کی مقبولیت بہت بڑھ گئی اور اس کے بہت سے نسخے لوگوں کے پاس جمع ہو گئے، ان کی نظر سے بھی متعدد نسخے گذرے، لیکن انھوں نے دیکھا کہ ان نسخوں میں غلطیاں بکثرت پائی جاتی ہیں، جو مقامات کاتبوں کی سمجھ میں نہ آ سکے ان میں انھوں نے تحریف کر دی تھی، اس بنا پر شیخ علی کو خود ایک صحیح اور جامع نسخہ مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس سلسلے میں غالبًا انھوں نے پہلے یہ کوشش کی کہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ان کو مل جائے جس کا ذکر انھوں نے کمال الدین محمد سے سنا تھا، لیکن وہ ان کو دستیاب نہ ہو سکا، بعد میں اس کا کچھ سراغ لگا، جیسا کہ خود ان کا بیان ہے کہ شیخ ابو القاسم المنفلوطی جب ۷۳۵ھ میں قاہرہ آئے تو انھوں نے بتایا کہ وہ نسخہ ان کے پاس موجود ہے، جو ان کو ان کے اسلاف سے ملا ہے۔ انھوں نے شیخ علی سے وعدہ بھی کیا کہ وہ اسے انکو دیدینگے لیکن پھر وہ منفلوط واپس چلے گئے، اور یہ نسخہ شیخ علی کو نہ مل سکا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر نکلسن کا یہ خیال کہ شیخ علی کے پیش نظر خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ تھا، صحیح نہیں ہے[1]

غرض شیخ علی کو کمال الدین محمد ہی کے نسخہ پر قناعت کرنی پڑی اور یہ نسخہ بھی بہرحال صحیح اور قابل اعتماد تھا، کیونکہ کمال الدین محمد نے اس کا مقابلہ مصنف کے

---

[1] Studies in Islamic Mysticism, Cambridge, 1921, P. 165

نسخہ سے کر لیا تھا، نیز یہ نسخہ مشکول بھی تھا، اس کے علاوہ کمال الدین محمد نے اسے باقاعدہ اپنے والد سے پڑھا بھی تھا، جیسا کہ بعد میں خود شیخ علی نے بھی اسے کمال الدین محمد سے صحت کے ساتھ پڑھا، بہرحال اسی نسخہ کی بنیاد پر شیخ علی نے ایک مکمل اور صحیح نسخہ مرتب کیا،

اس نسخہ کے سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس میں قصیدہ عینیہ[1] نہیں تھا، کیونکہ شیخ نے اس کو حجاز میں نظم کیا تھا، اور دیوان کو قیام قاہرہ کے دوران لکھایا تھا، کمال الدین محمد کو اس قصیدہ کا صرف مطلع یاد تھا جو یہ ہے:

أبرق بدا من جانب الغور لامعٌ أم ارتفعت عن وجه لیلی البراقعُ

(کیا غور کی سمت کوئی چمکنے والی بجلی نمودار ہوئی ہے یا لیلیٰ کے چہرہ سے نقاب اٹھ گیا ہے)

کمال الدین محمد نے اپنی زندگی میں اس قصیدہ کو بہت تلاش کیا لیکن انکو نہ مل سکا، اور وہ اپنے بھانجے شیخ علی کو وصیت کر گئے کہ وہ اس کی تلاش جاری رکھیں اور جب کہیں مل جائے تو اسے دیوان میں شامل کر دیں، چنانچہ شیخ علی عرصۂ دراز تک اس کی جستجو میں لگے رہے اور اس اثنا میں انھوں نے مذکورہ مطلع پر خود ایک قصیدہ نظم کر لیا جو دیوان کے آخر میں ان کے نام سے شامل ہے۔

لیکن بالآخر تلاش و جستجو سے وہ گم شدہ قصیدہ بھی شیخ علی کو مل گیا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن امیر کبیر نجم الدین قاسم بن امیر دار نے شیخ علی سے کہا کہ عارف کامل تاج الدین حسین بن احمد التبریزی اور بعض دوسرے علماء و مشائخ کی خواہش ہے کہ شیخ ابن الفارض کا کلام آپ سے سنیں، جس طرح آپنے ان کے صاحبزادے کمال الدین محمد سے سنا ہے، اور انھوں نے خود اپنے والد شیخ ابن الفارض سے سنا ہے، کیونکہ ان مشائخ

---

[1] اس قصیدہ میں قافیہ کا آخری حرف عین ہے اس لیے اس کو عینیہ کہا جاتا ہے، عربی میں قصائد کا نام عام طور پر اسی طرح رکھا جاتا ہے، مثلاً ہمزیہ، تائیہ، لامیہ وغیرہ

کو شیخ ابن الفارض سے روحانی تعلق ہے، شیخ علی نے امیر نجم الدین قاسم کی درخواست منظور کر لی اور ان کو ایک ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو خوش آواز ہو اور قرأت کی اہلیت بھی رکھتا ہو، تاکہ مجلس سماع میں سامعین پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں، ان کو پتہ چلا کہ اس کام کے لیے ایک مرد صالح شیخ برہان الدین ابراہیم بہت موزوں ہیں، چنانچہ انھوں نے ان سے اس خدمت کو انجام دینے کی درخواست کی، وہ راضی ہو گئے، اور وقت مقررہ پر امیر نجم الدین قاسم کے یہاں پہنچ گئے، وہاں جب شیخ برہان الدین نے شیخ علی کا مرتب کردہ نسخہ دیکھا اور اس کے مقدمہ میں گم شدہ قصیدہ عینیہ کا ذکر پڑھا تو انھوں نے بتایا کہ یہ قصیدہ تو خود ان کے پاس موجود ہے، لیکن ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کا ناظم کون ہے، اس کے بعد شیخ علی نے برہان الدین ابراہیم کے یہاں اپنے لڑکے کو بھیجکر اسکی نقل منگوائی اور اس کو دیوان میں شامل کر دیا، اس طرح تقریباً سو سال تک یہ قصیدہ اپنے ساتھیوں سے الگ رہا، شیخ کی وفات کے بعد ساٹھ[۶۰] سال تک ان کے صاحبزادے کمال الدین محمد نے اسے تلاش کیا اور ناکام رہے، پھر کمال الدین محمد کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق شیخ علی چالیس[۴۰] سال تک اس کی جستجو میں لگے رہے اور اتنی مدت کے بعد وہ ملا، یہ مبارک دن شیخ علی کی تحریر کے مطابق یوم پنجشنبہ تھا اور رجب ۷۳۳ھ کی پندرھویں تاریخ تھی[۱]

غرض شیخ ابن الفارض کے دیوان کا ایک باضابطہ اور مکمل نسخہ شیخ علی کے ہاتھوں اس طرح مرتب ہوا، اس کے بعد اس کے جتنے نسخے شائع ہوئے وہ تقریباً سب اسی نسخہ سے تیار کیے گئے، البتہ پروفیسر آربری نے ۱۹۵۲ء میں ابن الفارض کا جو دیوان رومن

۱؎ ملاحظہ ہو شرح دیوان ج ۲ ص ۱۰۹ - ۱۱۰

رسم خط میں لندن سے شائع کیا ہے، اس کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان کو ایک اور قدیم تر نسخہ دستیاب ہوا ہے، جو شیخ علی کے نسخہ کے علاوہ ہے، اس نسخہ کی کچھ تفصیل بھی پروفیسر آربری نے دیباچہ میں لکھی ہے، لیکن اس موقع پر اس کے ذکر کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی،

قصائد

دیوان میں چھوٹے بڑے کل ۲۴ قصیدے ہیں، اور یہی اس کا قابل ذکر حصہ کہے جانے کے مستحق ہیں، تین چار قصیدے تو بہت چھوٹے ہیں جو صرف آٹھ دس اشعار ہی پر مشتمل ہیں، ان کو قطعات کہنا زیادہ مناسب ہے، ایک قصیدہ خاص طور پر غیر معمولی طویل ہے، جو مختلف وجوہ سے نمایاں خصوصیات کا حامل ہے، اس کے اشعار کی تعداد ۷۶۰ ہے، اور التائیۃ الکبری کے نام سے مشہور ہے، باقی اوسط درجہ کے ہیں،

اکثر قصائد کا عمومی انداز غزلیہ ہے، جن میں مروجہ غزلیہ شاعری ہی کے رموز و علامات کا استعمال کیا گیا ہے، عشق و محبت، ہجر و فراق، اور شوق و وصال کے مضامین مختلف رنگ میں پیش کیے گئے ہیں، جن کی تفسیر حقیقی اور مجازی دونوں طریقوں سے کیجا سکتی ہے، ہیئت و اسلوب کے اعتبار سے غزلیہ اشعار اور ان قصائد میں کوئی فرق نہیں ہے، محض تفسیر و تعبیر کے ذریعہ یا شاعر کی زندگی کی روشنی میں انکو صوفیانہ اشعار کہا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اہل ظاہر اور اہل باطن دونوں ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں، اور حقیقی اور مجازی دونوں میدانوں میں ان قصائد کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، تاہم قصائد کے درمیان درمیان میں کہیں کہیں ایسے اشعار بھی ہیں جن کی تفسیر صرف حقیقی اعتبار سے ہی کیجا سکتی ہے، ان کی مجازی تعبیر

کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ درحقیقت یہی اشعار پورے قصیدے کو حقیقت تک پہنچادیتے ہیں، اور یہ اشعار عام طور پر وہ ہیں جن میں مقامات مقدسہ کا ذکر ہے۔ جو قاری کے ذہن کو حقیقت کی طرف موڑ دیتے ہیں اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ معشوق سے شاعر کی مراد شاہد حقیقی ہے، اور شاعر کی ساری رنگین بیانیاں اسی کے شئون و تجلیات ہیں، اگر شیخ کی زندگی پیش نظر ہو تو ذہن مجاز کی طرف منتقل ہی نہیں ہوسکتا۔

البتہ تائیہ کبریٰ کا انداز اس سے مختلف ہے، اس میں شاعر نے صوفیانہ مسائل سے متعلق اپنے تجربات و مشاہدات پیش کیے ہیں جس کا انداز تفسیریہ اور بیانیہ ہے، اس طرح یہ خالص صوفیانہ شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس میں شاعرانہ بلاغت اور جوش و جذبہ کی کمی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ قصیدہ شیخ کا ایک مستقل اور بڑا کارنامہ ہے، اور اس کو ان کے دیگر قصائد سے تقریباً وہی نسبت ہے جو مولانا روم کی مثنوی کو ان کے دیوان سے ہے، اس قصیدہ کا مشہور و معروف نام "نظم السلوک" ہے، جو بہت موزوں ہے، کیونکہ اس میں شیخ نے سلوک و طریقت کے مسائل و مراحل کے سلسلے میں اپنے خیالات و تجربات کو واعظانہ اور شارحانہ انداز میں بیان کیا ہے، پہلے اس کا نام شیخ نے انفاس الجنان و نفائس الجنان رکھا تھا، پھر لوائح الجنان و روائح الجنان میں تبدیل کردیا اور آخر میں ایک صاف اور سادہ نام نظم السلوک رکھا، اس سلسلے میں شیخ کا خود بیان ہے کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، آپ نے دریافت فرمایا کہ اے عمر! تم نے اپنے قصیدہ کا کیا نام رکھا ہے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! لوائح الجنان و روائح الجنان رکھا ہے، فرمایا کہ اس کا نام نظم السلوک رکھو، اس لیے میں نے اس کا یہی نام رکھ دیا[1]۔

[1] دیکھئے مقدمہ شرح دیوان، ص ۶-۷۔

اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

سقتنی حمیا الحب راحۃ مقلتی — وکأسی محیا من عن الحسن جلت

فاوھمت صحبی ان شرب شرابھم — بہ سر سری فی انتشائی بنظرۃ

وبالحدق استغنیت عن قدحی ومن — شمائلھا لا من شمولی نشوتی

(مجھے میری آنکھوں نے محبت کی شراب پلائی اور میرا ساغر اس محبوب کا رخسارہ ہے جس کا حسن و جمال تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔

میں جو ایک نظر سے سرمست ہوگیا تو اس سے میرے ساتھیوں کو یہ وہم ہوا کہ میرا دل بادہ نوشی کی وجہ سے مسرور و مخمور ہے۔

حالانکہ ان آنکھوں کی بدولت میں جام و ساغر سے مستغنی ہوں اور میرا خمار بادہ نوشی کے اثر سے نہیں ہے بلکہ اس محبوب کے شمائل کی وجہ سے ہے۔)

ان اشعار کو پڑھکر عراقی کا یہ شعر حافظہ میں تازہ ہوجاتا ہے:

نخستیں بادہ کاندر جام کردند — ز چشم مست ساقی وام کردند

اسی کے ساتھ میر کا یہ شعر بھی دماغ میں گردش کرنے لگتا ہے

میر ان نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

تائیہ کبریٰ کے علاوہ ایک اور قصیدہ بھی ہے جو دوسرے قصائد سے بڑی حد تک ممتاز نظر آتا ہے، اس میں شروع سے آخر تک شاعر نے شراب کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے اور اس کے اوصاف کے پردہ میں عشق کی مختلف کیفیات کو بیان کیا ہے، اسی لیے اس کو قصیدہ خمریہ بھی کہا جاتا ہے، یہ قصیدہ رمزیہ شاعری کی بہترین مثال ہے، اس کا مطلع یہ ہے:

شربنا علی ذکر الحبیب مدامة … سکرنا بہا من قبل ان یخلق الکرم

(ہم نے یاد حبیب میں ایسی شراب پی ہے جس کے نشہ میں ہم اسی وقت سرشار ہوئے تھے جب کہ انگور کی بیلیں وجود میں بھی نہیں آئی تھیں ۔)

حقیقت یہ ہے کہ عشق حقیقی اور حب الٰہی کی راہ میں جو سرمستی و بیخودی صوفیہ کو حاصل ہوتی ہے اس کے اظہار کے لیے شراب سے بہتر کوئی چیز ان کو نہ مل سکی ، اسیلے اکثر صوفی شعراء نے اس مقصد کے لیے اس کو استعمال کیا ہے ۔ فارسی میں خواجہ حافظ اس کے بادشاہ ہیں ، یہی چیز شیخ کے اس قصیدہ میں بھی پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی ان کے مخصوص شعری امتیازات میں بھی کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے ۔ اس لیے اسلوب و ہیئت کے لحاظ سے اس قصیدہ کو تائیہ کبری اور دیگر قصائد کے درمیان کی ایک کڑی کہا جاسکتا ہے ،

رباعیات قصائد کے بعد رباعیات کا درجہ ہے ، ان کی کل تعداد ۳۵ ہے ان میں کچھ ایسی بھی ہیں جو رباعی کے مستند اوزان کے مطابق نہیں ہیں ، ان کو دوبیتی کہا جاسکتا ہے ۔ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے ، رباعیات میں بھی عموماً وہی عشقیہ مضامین ملتے ہیں ، جو قصائد میں زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ہیں ، اور ان کی تفسیر بھی حقیقت اور مجاز دونوں نقطۂ نظر سے کی جاسکتی ہے ، رباعیات کے متعلق کچھ لکھنے کے بجائے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ کچھ رباعیاں نمونہ کے طور پر پیش کر دیجائیں ۔

اہوی قمرا لہ المعانی رق … من صبح جبینہ اضاء الشرق

تدری باللہ ما یقول البرق … ما بین ثنایاہ و بینی فرق

(مجھے ایک ایسے ماہتاب سے محبت ہے کہ معانی حسن اور لطائف جمال اسکے غلام ہیں

اور اسی کی صبح جبیں سے مطلع شرق روشن ہے ، بخدا کیا تم جانتے ہو کہ برق کیا کہتی ہو وہ کہتی ہو کہ میرے درمیان اور اسکے دانتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے)

روحی للقاک یا مناہا اشتاقت … والارض علیّ کاحتیالی ضاقت

والنفس لقد ذابت غراما وأسی … فی جنب رضاک فی الہوی ما لاقت

(اے جان تمنا ! میری روح تیری ملاقات کی مشتاق ہے اور حال یہ ہے کہ زمین مجھ پر تنگ ہے جس طرح میری سعی و تدبیر تنگ اور بے کار ہے ، میرا نفس گرمی عشق اور سوز غم سے پگھل چکا ہے پھر بھی تیرے آغوش رضا و محبت کا سزاوار نہیں ہے ۔)

عینی جرحت وجنتہ بالنظر … من رقتہا فانظر لحسن الاثر

لما جنت وقد جنیت ورد الخفر … الآن ادری کیف انشقاق القمر

(ذرا اس حسن اثر کو تو دیکھو کہ انتہائے رقت و لطافت کی وجہ سے اس کے رخسار کو میری نگاہ نے زخمی کر دیا ، میں نے حیا کے اس گلاب کو جو چن لیا تو یہ جرم صرف اس لیے کیا کہ معجزۂ شق القمر کی کیفیت دیکھ لوں ۔)

عاشق کے دیکھنے سے معشوق کے چہرہ پر شرم و حیا سے جو سرخی آجاتی ہے اس کو کس بلیغ انداز میں پیش کیا ہے ۔

اہوی رشأ رشیق القدّ حُلی … قد حکّمہ الغرام والوجد علی

ان قلت خذ الروح یقول لی عجبا … الروح لنا فہات من عندک شی

(میں ایک ایسے غزال رعنا سے محبت کرتا ہوں جو نرم و نازک اور حسین قد و قامت والا ہے ، فرط عشق نے مجھے اس کا غلام اور اس کو میرا حاکم بنا دیا ہے ، جب میں اس سے کہتا ہوں کہ جان حاضر ہے تو وہ ایک عجیب بات کہتا ہے کہ جان تو ہماری ہی چیز ہے ، اگر تیرے پاس کوئی اپنی چیز ہو تو اسے پیش کر)

اسی مضمون کو مرزا غالب نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح ادا کیا ہے:

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یاحادی قف بی ساعۃ فی الربع — کی اسمع او اری ظباء الجزع

ان لم ارھم او استمع ذکرھم — لاحاجۃ لی بناظری والسمع

(اے حدی خواں! تھوڑی دیر دیار حبیب میں مجھے روک لینا تاکہ میں غزالان وادی کی زیارت کرلوں یا کم از کم ان کی آواز ہی سن لوں، کیونکہ اگر میں نے انھیں نہ دیکھا اور ان ہی کا ذکر سنا تو مجھے نہ بصارت کی ضرورت ہے نہ سماعت کی۔)

یہی خیال خواجہ میر درد کے یہاں اس طرح ملتا ہے:

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

الغاز و معمیات: دیوان کے آخر میں کچھ معمے اور پہیلیاں بھی ہیں، جن کی تعداد ۱۹ ہے، بعض شارحین نے ان کی تفسیر بھی صوفیانہ نقطۂ نظر سے کی ہے اور کھینچ تان کر عجیب و غریب معانی نکالے ہیں، لیکن میرے خیال میں شیخ نے محض زمانہ کے رواج کے تحت یہ پہیلیاں کہی ہیں، بہرحال نمونہ کے طور پر ایک پہیلی پیش کیجاتی ہے، تاکہ شیخ کے فنی کمال کا اندازہ ہوسکے اور دیوان کا سرسری تعارف بھی مکمل ہوجائے:

مابلدۃ بالشام قلب اسمھا — تصحیفہ اخری بارض العجم

وثلثہ ان زال من قلبہ — وجدتہ طیراً شجی النغم

وثلثہ نصف وربع لہ — وربعہ ثلثاہ حین انقسم

(شام میں وہ کونسا ایسا شہر ہے جس کے نام کو اگر مقلوب کرکے اس میں تصحیف کردیجائے تو وہ سرزمین عجم کا ایک دوسرا شہر ہو جائے، اس کا ایک تہائی اگر اس کے قلب سے نکل جائے تو وہ پرسوز

نغمہ والا ایک پرندہ بنجائے، جب وہ منقسم ہو تو اس کا ایک تہائی اس کا نصف اور چوتھائی ہو جائے اور اس کا دو تہائی اس کا صرف ایک چوتھائی رہ جائے)

یہ شہر حلب ہے اس کو اگر مقلوب کردیا جائے تو یہ بلح ہو جائے گا، پھر جب اس میں تصحیف کیجائے تو بلخ ہو جائے گا جو عجم کا ایک دوسرا شہر ہے، اس لفظ میں تین حروف ہیں اس لیے ایک تہائی ایک حرف ہوا، اور جب اس کے وسط سے ایک تہائی یعنی بیچ والا حرف ل نکال دیا جائے تو حب رہ جائیگا اور حب ایک پرندہ کو کہتے ہیں، جسکی آواز نہایت درد انگیز ہوتی ہے، اب حساب جمل کے لحاظ سے ح، ل اور ب کے اعداد بالترتیب ۸، ۳۰ و ۲ ہوتے ہیں، جن کا مجموعہ ۴۰ ہے، اور حرف ح اور ب کے اعداد کا مجموعہ ۱۰ ہوتا ہے، جو کل مجموعہ کا ایک چوتھائی ہے، پس اس لفظ کے ایک تہائی یعنی حرف ل کا عدد (۳۰) کل کے نصف (۲۰) اور چوتھائی (۱۰) کے برابر ہے ($\frac{۴۰}{۲} + \frac{۴۰}{۴} = ۲۰ + ۱۰ = ۳۰$)۔ اور اس کا دو تہائی یعنی حروف ح اور ب ملکر ($۸ + ۲ = ۱۰$) اس کا ایک چوتھائی ($\frac{۴۰}{۴} = ۱۰$) ہے۔

کلام کی اہمیت و مقبولیت: شیخ کا دیوان ضخامت کے لحاظ سے مختصر ہے، لیکن اس سے اس کی قدر و قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، حقیقت یہ ہے کہ یہ دیوان "ہرچہ بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا مصداق ہے، شیخ کا سب سے بڑا شاہکار قصیدہ تائیہ کبریٰ ہی ہے جس کی اہمیت کا خود ان کو بھی احساس تھا، چنانچہ اس کے متعلق ایک روایت[1] یہ ملتی ہے کہ شیخ کے معاصر علما میں سے کسی نے ان کی خدمت میں حاضر ہوکر اس کی شرح لکھنے کی اجازت طلب کی، شیخ نے پوچھا کتنی جلدوں میں اس کی شرح لکھوگے، جواب دیا کہ دو[2]

[1] مقدمہ شرح دیوان ص ۷

جلدوں میں، شیخ نے مسکرا کر فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو اس کے ایک ایک شعر کی شرح دو دو جلدوں میں لکھ دوں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ خود اپنے اس قصیدہ کو کتنا بیش قیمت اور بلند پایہ سمجھتے تھے،

اس سلسلے میں یہ روایت[1] بھی قابل ذکر ہے کہ ایک بار شیخ اکبر محی الدین ابن العربی نے شیخ ابن الفارض سے اس قصیدہ کی شرح لکھنے کی اجازت مانگی تو شیخ نے ان کو جواب دیا کہ آپ کی "فتوحات مکیہ" ہی اس کی شرح ہے، یہ روایت پروفیسر نکلسن کے نزدیک قابل اعتماد نہیں ہے[2] کیونکہ "فتوحات مکیہ" شیخ ابن الفارض کی وفات کے صرف تین سال قبل لکھی گئی تھی، نکلسن کا کہنا ہے کہ کسی معتبر ذریعہ سے ان دونوں بزرگوں کی ملاقات ثابت نہیں ہے صرف یہی ایک روایت ملتی ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ دونوں باہم متعارف تھے یا بعض اشعار سے شارحین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ابن العربی ہی ابن الفارض کے استاد تھے، یہ چیز بھی نکلسن کے نزدیک پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی، کیونکہ ابن الفارض کے اشعار میں ابن العربی کا کوئی نمایاں اثر نہیں ملتا، نکلسن کے اس قول پر بحث کیجا سکتی ہے، لیکن اس موقع پر ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اولاً محض اس بنا پر مذکورہ روایت کو قطعی طور پر غلط نہیں قرار دیا جا سکتا، اور اگر بالفرض وہ غلط بھی ہو تو بھی اس سے کم از کم اتنا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ عوام و خواص کی نظروں میں یہ قصیدہ کس قدر بلند پایہ تھا۔

بہر حال یہ قصیدہ بیحد مقبول ہوا، اور متعدد علماء نے اس کی شرحیں لکھیں، اگرچہ ان میں سے اکثر شرحیں اب ناپید ہو چکی ہیں، اس کے مشہور شارحین میں سراج الہندی الحنفی، شمس البساطی المالکی، جلال القزوینی الشافعی، الفرغانی، القاشانی اور القیصری وغیرہ ہیں،[3]

---

[1] مقری، نفح الطیب، القاہرہ ۱۹۴۹ء ج ۲ ص ۳۶۵

[2] Studies in Islamic Mysticism, Preface, VIII Foot note

[3] تفصیل کے لیے دیکھئے "کشف الظنون" التائیہ فی التصوف

اس کے علاوہ قصیدہ خمریہ کی بھی متعدد شرحیں لکھی گئیں اور قصیدہ یائیہ کی شرح علامہ جلال الدین سیوطی نے لکھی[1]، اسی طرح تائیہ اور مخصوص قصائد کے علاوہ باقی دیوان کی بھی مکمل شرح لکھی گئی، شیخ حسن البورینی اور شیخ عبد الغنی النابلسی کی شرحیں کافی مشہور اور رائج ہیں، البورینی نے لغوی اور نحوی لحاظ سے شرح کی ہے، اور النابلسی نے صوفیانہ نقطۂ نظر سے۔ ان دونوں شرحوں کو بعد میں رشید بن غالب نے یکجا کر کے شائع کیا ہے، یہی شرح اس وقت راقم الحروف کے پیش نظر ہے۔

بعض قصائد اس قدر مقبول ہوئے کہ شعرا نے اس پر تضمین کی اور اسی بحر و قافیہ میں خود قصیدے لکھے، اس سلسلے میں شیخ کا قصیدہ رائیہ قابل ذکر ہے جس میں جوش و مستی کے ساتھ بڑی دلآویز والہانہ کیفیت بھی پائی جاتی ہے، اس قصیدہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:۔

زدنی بفرط الحب فیک تحیرا　　وارحم حشی بلظی ہواک تسعرا

واذا سألتک ان اراک حقیقۃ　　فاسمح ولا تجعل جوابی لن ترا

(فرط محبت سے میری حیرت کو زیادہ سے زیادہ کر دے اور میرے باطن پر رحم کر جو تیری محبت کے شعلوں میں بھڑک رہا ہے۔ اور جب میں تجھ سے عرض کروں کہ میں تجھے حقیقت کے لباس میں دیکھنا چاہتا ہوں تو اس کی اجازت دیدے اور مجھے یہ جواب نہ دے کہ تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا،)

جن شعرا نے اس قصیدہ کی تقلید میں قصیدے کہے ہیں ان کے نام شیخ حسن البورینی نے دیے ہیں اور ہر قصیدہ کا مطلع بھی درج کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ کے قصیدہ میں جو متانت و بلاغت ہے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا،[2]

---

[1] دیکھئے شرح دیوان، ج ۲ ص ۱۶

[2] ایضاً ج ۱ ص ۴۸۰، ۱

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شیخ کے دیوان کی کیا اہمیت ہے اور اس کو کس قدر شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، اس موقع پر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شیخ کے کلام کی یہ عظمت و مقبولیت محض ان کے صوفیانہ خیالات کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ اس میں ان کے فنی کمال اور ان کی شاعری کے جمالیاتی پہلو کو بھی بڑا دخل ہے، یہ صحیح ہے کہ وہ ایک صوفی کی حیثیت سے مشہور ہوئے کیونکہ انھوں نے زاہدانہ زندگی گزاری اور تصوف میں ایک خاص مسلک اپنایا، لیکن ان کی شہرت درحقیقت ان کی شاعری کی وجہ سے زیادہ ہوئی، اور شاعری میں بھی ان کو اتنا بلند مقام اس لیے حاصل نہیں ہوا کہ وہ صوفی شاعر تھے بلکہ اس لیے کہ وہ ایک عاشق صادق اور غزلگو شاعر تھے، ان کے بعض قصائد اور مخصوص مقامات میں جو صوفیانہ خیالات ملتے ہیں، ان کا انداز فلسفیانہ نہیں ہے بلکہ وہ ان کے قلبی واردات اور داخلی کیفیات و تاثرات ہیں جن کا اظہار نہایت پرکیف، وجد آفریں اور والہانہ انداز میں ہوا ہے، عام قصائد میں تو زیادہ تر ایسے ہی عشقیہ مضامین پائے جاتے ہیں جو حقیقی اور مجازی دونوں مفہوموں کو عام ہیں، اور ان میں بظاہر کوئی جدت و ندرت بھی محسوس نہیں ہوتی، لیکن ان کے لب و لہجہ میں بلا کی دلآویزی بیخودی و سرمستی، شوق اور محویت پائی جاتی ہے اور جذبات میں اس قدر شدت و قوت ہوتی ہے کہ الفاظ کی تہوں میں ایک سیمابی روح دوڑتی معلوم ہوتی ہے،

یہ صحیح ہے کہ بعض علماء نے شیخ کی مخالفت کی ہے، اور ان کے کلام پر اعتراضات کیے ہیں لیکن یہ وہ اشعار ہیں جن میں شیخ نے قرب الٰہی کی کیفیت کو شدت جوش میں اس انداز سے بیان کیا ہے کہ ظاہر الفاظ سے حلول و اتحاد کا مفہوم نکلتا ہے، مگر جہاں تک نفس شاعری کا تعلق ہے ہر صاحب ذوق شیخ کے کلام کا مداح نظر آتا ہے، چنانچہ علامہ ذہبی نے

ان کو اپنے زمانے کا سید الشعرا کہا ہے، اور عبد الرؤف المناوی نے ان الفاظ میں ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے،

"الملقب فی جمیع الآفاق بسلطان المحبین والعشاق، المنعوت بین اہل الخلاف والوفاق بانہ سید شعرائہ علی الاطلاق"۔[1]

اس میں شک نہیں کہ شیخ اپنے زمانہ میں بھی مسلم الثبوت استاد کی حیثیت رکھتے تھے، اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے، شیخ کے معاصرین میں محمد بن سوار بن اسرائیل اور شہاب الدین بن الخیمی دو مشہور شاعر تھے، ان دونوں کے درمیان ایک قصیدہ کی ملکیت کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا جس کا مطلع یہ ہے:-

یا مطلبا لیس لی فی غیرہ ارب — الیک آل التقصی وانتہی الطلب

(اے وہ مطلوب جس کے سوا مجھے کسی کی حاجت نہیں، میری جستجو کا مرجع اور طلب کا منتہا تو ہی ہے)

دونوں نے اس قصیدہ کی ملکیت کا دعویٰ کیا، اور اس کے فیصلہ کے لیے دونوں ادبا ایک مجمع میں اکٹھا ہوئے اور اس مسئلہ پر بحث ہوئی لیکن کوئی تصفیہ نہ ہو سکا، دونوں نے شیخ ابن الفارض کو ثالث بنا دیا، شیخ نے حکم دیا کہ وہ اسی بحر و قافیہ میں دوبارہ قصیدہ لکھیں، چنانچہ دونوں نے ایک ایک قصیدہ لکھ کر شیخ کے سامنے پیش کیا، شیخ نے دونوں قصیدوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ابن الخیمی کے حق میں فیصلہ صادر کیا، جسے سب نے تسلیم کیا۔[2]

اس سلسلے میں ہم ابن ابی حجلہ کے الفاظ نقل کرتے ہیں جو شیخ کے بعض صوفیانہ خیالات کی بنا پر ان کے بارے میں اچھا اعتقاد نہیں رکھتے تھے، مگر ان کی شاعری کے قائل تھے، چنانچہ ان کے دیوان کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان ہیں:-

---

[1] شذرات الذہب: ۵/۱۴۹ [2] فوات الوفیات: ۲/۲۳۱ و ۲۵۸

هو من ارق الدواوین شعراً
وانفسها درا ابراً وبحراً واسرعها
للقلوب جرحا واکثرها علی الطلول
نوحا اذ هو صادر عن نفثة
مصدور وعاشق مهجور
وقلب بجالنوی مکسور
والناس لهجون بقوافیه
وما اودع من القوی فیه
وکثر حتی قل من لا رائی
دیوانه او طنت باذنه
قصائده الطنانة

(شذرات الذهب : ۵/ ۱۵۱)

یہ ایسا دیوان ہے جس کے اندر حد درجہ
شاعرانہ لطافت پائی جاتی ہے، اس میں
بحر و بر کی بیش قیمت اور نفیس ترین
موتیاں موجود ہیں، یہ دلوں کو بہت جلد
زخمی کر ڈالنے والا ہے اور ٹیلوں اور
کھنڈروں پر بہت زیادہ نوحہ کرنے والا
ہے، کیونکہ یہ ایک ایسے سینہ سے نکلا ہے
جو بیمار تھا، اور ایک ایسے عاشق کا
نالہ ہے جو ہجر زدہ تھا، اور ایک ایسے
دل کی آہ ہے جو درد فراق سے شکستہ تھا
لوگ اس کے اشعار کے بیحد دلدادہ ہیں
کیونکہ اس کے اندر بڑی طاقت پنہاں ہے
اس کی شہرت کا یہ عالم ہے کہ بہت کم
ایسے لوگ ہوں گے جن کی آنکھوں کو
اس دیوان نے نہ گرمایا اور جن کے
کانوں کو اس کے قصائد رنانہ نے
نہ کھنکھنایا ہو۔

(باقی)

اسلامی ہند کی علمی خودداری

الدرۃ الثمینۃ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی
اور
شاہجہاں اور نواب سعد اللہ خاں

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش

(۲)

(ج) الدرۃ الثمینۃ کی وجہ تصنیف اور سنہ تصنیف

[دیکھئے محلات نظریہ میں سے ۱، ۳، ۷/۷، ۸، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۶]

تصنیف | فاضل مقالہ نگار نے کتب خانہ رامپور کے مخطوطہ ۴۸ فن کلام عربی کے بارے میں لکھا ہے:۔

"خط مولویانہ شکست آمیز صفحات ۲۷ سنہ ۱۰۵۷ھ کا لکھا ہوا ہے"۔

آگے چل کر لکھا ہے:۔

"ملا صاحب کا انتقال ۱۰۶۰ھ یا ۱۰۶۶ھ میں ہوا ہے، اس لیے یہ رسالہ انکی زندگی ہی کا لکھا ہوا ہے"۔

مگر ۱۰۵۷ھ پیش نظر مخطوطہ کا سالِ کتابت نہیں ہے، بلکہ خود متن "الدرۃ الثمینۃ" کا سالِ تصنیف ہے، جیسا کہ خود مصنف علام نے رسالہ کے آخر میں تصریح کی ہے:۔

"ولیکن هذا آخر ما اردنا ایراده فی هذه الرسالة الخاقانیة حامداً
للہ تعالیٰ ومصلیاً علی نبیه وآله۔ شارعاً فی تحریره ضحوة یوم الجمعة
خامس شهر ربیع الثانی متمماً فی آخر یوم الجمعة ثانی عشر منه من ۱۰۵۷ھ۔"

بظاہر یہ کاتب کا ترقیمہ نہیں ہے، بلکہ خود مصنف کی تصریح ہے، کیونکہ کاتب کا کام محض تحریر وکتابت تھا، "ایراد" (بیان) سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، اسے یہ کہنے کا کوئی حق نہ تھا کہ "ولیکن هذا آخر ما اردنا ایراده فی هذه الرسالة الخاقانیة"

وجہ تصنیف مصنف کی اس غیر مبہم تصریح کے علاوہ رسالہ کی ترتیب وتحریر کا تاریخی پس منظر بھی اس بات کا شاہد ہے کہ یہ رسالہ ۱۰۵۷ھ (ماہ ربیع الثانی) میں لکھا گیا تھا، اس کے لیے ہند ایران کے روابط پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا مستحسن ہوگا،

ہند ایران کے روابط سیاسیہ کی تجدید دسویں صدی ہجری نئے نئے سیاسی انقلابات لیکر آئی، ایران اور وسط ایشیا میں تیموری خاندان کا اقتدار ختم ہو رہا تھا، آق قیونلو اور قراقیونلو ترکمانوں کے ہاتھوں، نیز برادرانہ خانہ جنگیوں کے نتیجے میں اب اس خاندان کی شوکت وعظمت ایک بھولی بسری داستان بن رہی تھی، خانوادہ تیموریہ کا آخری قابل ذکر تاجدار سلطان حسین مرزا ۹۱۱ھ میں انتقال کر گیا، دوسرا شاہزادہ ظہیر الدین محمد بابر تھا، اس نے بھی بار بار آبائی سلطنت سمرقند کو فتح کرنے کی کوشش کی، مگر ہر مرتبہ ناکامی ہوئی۔ اور آخر وطن مالوف سے نکلنے پر مجبور ہوا، اور پہلے کابل میں پھر ہندوستان میں لودی سلاطین کے اقتدار کو ختم کرکے مغل سلطنت قائم کی جو ۹۳۳ھ سے ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء) تک قائم رہی،

اُدھر ایران میں شاہ اسمٰعیل صفوی نے ۹۰۸ھ میں وہاں کے ترکمان خاندانوں کو ختم کرکے صفوی خاندان کی قومی حکومت قائم کی۔

اس طرح ترکمان صفویوں اور مغلوں کے مشترک دشمن تھے، اور ان کے استیصال وبیخکنی کے مشترک جذبے نے دونوں میں سیاسی اور ڈپلومیٹک روابط کی تجدید کی، چنانچہ ۹۱۷ھ میں شاہ اسمٰعیل صفوی کے سپہ سالار اعظم نجم ثانی اور بابر کی متحدہ فوجوں نے ازبکوں پر حملہ کیا۔ قلعہ غجدوان کے نیچے زبردست جنگ ہوئی جس میں امیر نجم ثانی مارا گیا، اور بابر بے نیل مرام کابل کی طرف چلا گیا، مگر "مبانی خلوص و داد" کا دونوں خاندانوں میں آغاز ہو گیا۔

بابر کے بعد ہمایوں اور شاہ اسمٰعیل صفوی کے بعد شاہ طہماسپ ہندوستان اور ایران میں تخت نشین ہوئے، ہمایوں ۹۴۹ھ میں شیر شاہ کے ہاتھوں ہندوستان سے نکلنے پر مجبور ہوا، اور شاہ طہماسپ کے پاس جاکر پناہ لی، اس طرح یہ روابط اور مستحکم ہو گئے، ہمایوں نے ۹۶۲ھ میں پھر شیر شاہ کے جانشینوں سے کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کی مگر اگلے سال ہی وفات پا گیا، اس کے بعد اکبر تخت نشین ہوا، صفوی خاندان میں اس کا معاصر شاہ عباس (اول) تھا جو اپنی عظمت وشوکت کی بنا پر شاہ عباس اعظم کہلاتا ہے، دونوں تاجداروں میں غیر معمولی محبت وخلوص تھا، اور مخلصانہ خط وکتابت بھی تھی، چنانچہ "دفتر ابوالفضل" میں متعدد خطوط اکبر کی جانب سے شاہ عباس اعظم کو لکھے ہوئے ملتے ہیں،

اکبر کا بیٹا جہانگیر تھا جو اس کے بعد اس کا جانشین ہوا، اس کے اور شاہ عباس اعظم کے درمیان بھی بڑی محبت تھی،

غرض شاہ اسمٰعیل صفوی سے لیکر شاہ عباس اعظم تک مغل خاندان اور صفوی تاجداروں میں بڑے مخلصانہ تعلقات قائم رہے، چنانچہ شاہ جہاں نے شاہ عباس ثانی کو اپنے پہلے خط میں تحریر کیا تھا،

"پیوستہ میان خواقین این دو دمان سلاطین نشان (تاجداران خاندان مغلیہ) وفرمانروایان سلسلہ صفویہ ابواب اتحاد و وداد مفتوح بود" (بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری جلد دوم ص ۹۳)

کشیدگی اور اس کا اندمال شاہ عباس اعظم کی وفات پر اس کا بیٹا شاہ صفی تخت نشین ہوا، وہ بڑا ظالم اور درشت خو تھا، اس کی تفصیل ایران کی تاریخوں میں مذکور ہے، اسی درشت خوئی کے نتیجے میں دونوں تاجداروں شاہ صفی اور جہانگیر میں ان بن ہوگئی، قندھار پر دونوں قبضہ کرنا چاہتے تھے، معاملہ لڑائی تک پہنچا جس کی تفصیل عہد جہانگیری کی سیاسی تاریخوں میں مذکور ہے، اسکے نتیجہ میں دونوں حکومتوں کے درمیان تعلقات منقطع ہوگئے،

جہانگیر کا آخری زمانہ بڑی بیچینی میں گذرا، اس کی وفات پر شاہ جہاں تخت نشین ہوا، مگر اس کی تخت نشینی بھی پرسکون حالات میں ظہور پذیر نہیں ہوئی، اس لیے داخلی فتنوں اور متوقع خانہ جنگیوں کے ساتھ ساتھ بیرونی طاقتوں سے زور آزمائی، تدبر و مصلحت اندیشی سے خالی تھی، ادھر درشت خو شاہ صفی کا بھی انتقال ہوچکا تھا اور اس کا جانشین شاہ عباس ثانی زیادہ بدخو نہ تھا، اس لیے نئے مغل تاجدار شاہجہاں نے اسی میں مصلحت دیکھی کہ نئے صفوی حکمراں (شاہ عباس ثانی) کے ساتھ محبت و وداد کی رسم قدیم کی تجدید کی جائے، چنانچہ اس نے ایک کاردان امیر جان نثار خاں کو دربار ایران میں ہندوستان کا سفیر بنا کر بھیجا تاکہ وہ موجودہ کشیدگی کو دور کرکے دونوں حکومتوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو بحال کرسکے ۱۰۵۶ھ میں اس سفارت کو ایران روانہ کیا گیا، عبدالحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" میں لکھا ہے:

"وہژدہم ایں ماہ (صفر ۱۰۵۶ھ) اورا (جان نثار خاں را) بخلعت وجمدھر و باضافہ پانصدی ذات و دو ہزاری پانصد سوار ...... سرفراز ساختہ دستوری دادند و ...... مصحوب او گرامی مرسلہ مبنی از مراسم تعزیت و مبنی از لوازم تہنیت کہ علامی سعد اللہ خاں بامر اعلیٰ انشا نمودہ، مانخے مرصع آلات و پنج ہزار پارچہ ...... برسم ارمغان ارسال فرمودند۔" (بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۴۹۳)

خوش قسمتی سے عبدالحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" میں اس خط کو من وعن نقل کیا ہے:-

"چوں پیوستہ میان خواقین ایں دودمان سلاطین نشاں (خاندان مغلیہ) و فرمانروایان سلسلۂ صفویہ ابواب اتحاد و وداد مفتوح بود ...... ہر چند شاہ صفی در اواخر ایام سلطنت از قلت تجربہ و دیگر موجبات غفلت و غرور مصدر بعضے اندیشہائے بیجا و نگالشہائے ناسزا کہ باعث رنجیدن یل رنجانیدن باشد، گشت۔ او زنگ آرائے جہانبانی (شاہ جہاں) ...... بعد از ارتحال شاہ مذکور نہ پسندیدند کہ سلسلہ مصافات و رابطۂ موالات کہ از دیر باز موکد است، یکبارہ گسیختہ شود۔ بنا براں مقرر ساختند کہ جان نثار خاں را کہ از خانہ زادان آداب دان مزاج شناس است، بتعزیت شاہ صفی و تہنیت پسر او کہ بنام جد خویش شاہ عباس مسمی است بفرستند۔" (ایضاً)

جان نثار خاں بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ روانہ ہوا اور ابھی وہ فراہ پہنچا تھا کہ ایک دوسرا قاصد آکر اس سے ملا، یہ میر عزیز تھا، جسے شاہ جہاں نے ایک خط دیکر ازبک تاجدار نذر محمد خاں کے پاس اسی سال ۸ رجب کو بھیجا تھا، چنانچہ عبدالحمید لکھتا ہے:

"میر عزیز ...... را ...... ہشتم ایں ماہ (رجب ۱۰۵۶ھ) پیش وے (نذر محمد خان) فرستادند ...... میر عزیز باستعجال تمام راہی گشتہ و آں سوئے فراہ بجان نثار خان پیوستہ، یرلیغ قضا نفاذ کہ از پیشگاہ عنایت بجان مزبور ارسال یافتہ بود، رسانید۔" (ایضاً صفحہ ۵۷۳-۵۷۶)

میر عزیز کو حکم تھا کہ جتنا بھی جلد ہوسکے اس خط کو نذر محمد خاں والی بلخ تک پہنچا دے اس لیے وہ جان نثار خاں کو سکون و اطمینان کے ساتھ طے منازل کرتا ہوا چھوڑ کر

باد وباراں کی رفتار سے مملکت صفویہ کے پایہ تخت اصفہان پہنچا، مگر اس کے پہنچنے سے پیشتر ہی نذر محمد خاں اصفہان سے خراسان کی طرف جا چکا تھا، میر عزیز چاہتا تھا کہ فوراً اس کی تلاش میں خراسان روانہ ہو جائے، مگر شاہ عباس ثانی نے مشورہ دیا کہ وہیں ایران میں ۱۰ ذی الحجہ تک قیام کرے، اس عرصہ میں جان نثار خاں بھی آجائیگا اور عید الاضحیٰ کے دن صفوی دربار میں باریاب ہوگا۔ شاہ عباس کا مشورہ عبد الحمید نے اس طرح نقل کیا ہے:

"اولیٰ آنکہ چوں آمدن جان نثار خاں نزدیک است، چندے توقف نمودہ عید الاضحیٰ کہ ساعت ملازمت او مقرر ساختہ ایم ہمراہ او بار یابند۔" (ایضاً ص ۵۲۶)

اس کی تفصیل تو نہیں ملتی کہ جان نثار خاں دار السلطنت اصفہان میں کب پہنچا (غرہ رجب اور ۱۰ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ کے درمیان ضرور پہنچا ہوگا) مگر اتنا یقینی ہے کہ صفوی دربار میں اس کی باریابی پہلی مرتبہ ۱۰ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ کو ہوئی۔

جس وقت سے جان نثار خاں اصفہان پہنچا، اُس وقت سے ۱۰ ذی الحجہ تک کا سارا وقت سیاسی نوعیت کی ملاقاتوں میں گذرا ہوگا، خواہ یہ ملاقاتیں وزیر اعظم سے ہوئی ہوں یا دیگر امرائے دربار سے اور نہ صرف جان نثار خاں، بلکہ سفارت کا پورا عملہ خوشگوار تعلقات کی بحالی میں مصروف رہا ہوگا اور اس عرصہ میں ثقافتی تفریحات کا موقعہ شاید ہی مل سکا ہو،

ثقافتی مشاغل کا آغاز غالباً جان نثار خاں اپنی کاردانی و طلاقت لسانی سے کار مفوضہ کی انجام دہی میں کامیاب ہوا، اور صفوی اور مغل خاندان کی کشیدگی دور ہو کر خوشگوار تعلقات پھر سے بحال ہو گئے،

اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ایرانی دربار کے وجوہ و اعیان اور

ہندوستانی سفارت خانہ کے عملہ کے درمیان علمی مباحث کا سلسلہ شروع ہو گیا، ہندوستانی سفارت خانہ کے عملہ نے آدابِ مناظرہ میں اپنی دستگاہ عالی اور طلاقت لسانی سے ایرانیوں کے مقابلہ میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھیں وزیر اعظم کی مجلس میں باریابی کا شرف حاصل ہوا،

ہندوستانی سفارت خانہ کے عملہ میں دو شخصوں کو اپنی معقولات دانی پر ناز تھا، ان میں سے ایک سفارت خانہ کا مشرف محمد فاروق تھا، اور دوسرا وقائع نویس محب علی۔ اُدھر وزیر اعظم ایران حکمت و معقولات کا فاضل متبحر تھا، ایران ہمیشہ سے فلسفہ و حکمت کا گہوارہ رہا ہے، اور ان علوم کے ماہر ہی کو وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر صفوی عہد میں مامور کیا جاتا تھا، چنانچہ علامی سعد اللہ خاں نے اپنے مکتوب میں جسے انھوں نے علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی کو بھیجا تھا، لکھا تھا:-

"خلیفہ سلطان وزیر دانشور عراق کہ اعلم العلمائے آں دیار است۔"

وزیر اعظم نے جس کا لقب "خلیفہ سلطان" ہوا کرتا تھا، جیسا کہ عبد الحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" (جلد دوم صفحہ ۶۵۹) میں لکھا ہے:-

"خلیفہ سلطان اعتماد الدولہ کہ لقب وزیر فرمانروائے ایران است۔"

اس نے ان مدعیان علم و فضل کے مبلغ علم کا اندازہ لگا لیا، ہندوستانیوں کا علم بحاثی تک محدود تھا، علمی نکات سے ان کو بہت کم واسطہ تھا، اس لیے اس نے منطق و فلسفہ کے مسائل میں مناظرہ کرنے کے بجائے ان لوگوں سے امتحاناً کہا کہ امام غزالیؒ نے ابو نصر فارابی اور بوعلی سینا کی مسائل ثلثہ [قدم عالم، انکار حشر اجساد اور انکار علم باری بجزئیات مادیہ] کے قول کی بنا پر تکفیر کی ہے، مگر بعض اہل علم نے حکما کے قول کو نیک محمل پر محمول کیا ہے، اس

تاویل کی تقریر کیجئے۔

ہندوستانی فضلا، تاریخی حقائق سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے، لہٰذا انھوں نے "سوال از آسمان جواب از ریسمان" کے مصداق اپنی ناواقفیت کو لفاظی کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی، مگر ان کا جہل مرکب اہل نظر سے مخفی نہ رہ سکا، اور ہندوستانی فضل و کمال کی دیارِ غیر میں بڑی ہوا خیزی ہوئی۔

اسی واقعہ کا علامی سعد اللہ خاں نے اپنے خط میں جو انھوں نے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کو لکھا تھا، ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

"افادت پناہ افاضت دستگاہ خلیفہ سلطان وزیر دانشور عراق کہ اعلم العلمائے آں دیار است از محمد فاروق مشرف و محب علی واقعہ نویس کہ با امارت مآب جان نثار خاں سفیر متعین اند، پس از دعوائے اینان بفضل و کمال پرسید کہ امام غزالی در مسئلہ قدم عالم و نفی علم واجب تعالیٰ شانہ عما یقول الظالمون فی حق انفسھم والجاھلون باللہ جلالاً کبیراً، بجزئیات مادیہ و نفی حشر اجساد تکفیر ابو نصر فارابی و شیخ ابو علی سینا نمودہ۔ وجہے تاویل کلام حکما، کردہ اند۔ ایں مراتب را تقریر باید کرد۔ مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند و از مسلک معقولیت دور افتادند۔" [پورا خط معارف بابت ستمبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۲۰۷-۲۰۸ میں نقل ہو چکا ہے]

غرض یہ مناظرہ ۱۰۵۷ھ کے ابتدائی مہینوں میں ہوا ہوگا، اور یقیناً ۱۰ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ کے بعد کیونکہ اس وقت تک کا سارا زمانہ ہندوستانی سفیر نے سیاسی گفت و شنید میں گزارا ہوگا، اور اس کے بعد ثقافتی تعلقات اس حد تک بڑھانے کے لیے کہ ہندوستانی سفارت خانہ کا عملہ عام ایرانی فضلا، پر اپنے تبحر فی المعقولات کا سکہ بٹھا کر، وزیر اعظم ایران کے ساتھ بے تکلفی

کے ساتھ علمی مباحثہ کر سکے، دو تین مہینے ضرور لگے ہوں گے، لہٰذا یہ بآسانی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ یہ مناظرہ صفر یا ربیع الاول ۱۰۵۷ھ میں ہوا ہوگا،

اس کے بعد پرچہ نویس نے اس ہوا خیزی کی اطلاع بادشاہ کو دی ہوگی، جو آخر ربیع الاول میں اس کے گوش گزار ہوئی ہوگی، اس وقت بادشاہ کابل میں تھے کیونکہ وہ آخر صفر ۱۰۵۷ھ میں لاہور سے روانہ ہوئے، جیسا کہ عبدالحمید لاہوری نے لکھا ہے:۔

"بنفس نفیس ہژدہم ماہ صفر (۱۰۵۷ھ) بعد از دو پہر و چار گھڑی روز بساعت کہ تولی کنند بد و تقویم از دار السلطنۃ لاہور بصوب دار الملک کابل نہضت فرمودند"

(بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۴۳۸)

اور ربیع الاول کی آخری تاریخ کو کابل پہنچے

"سلخ ربیع الاول بساعت مختار نزہت گاہ کابل بنور ماہچۂ اعلام ضیا و سنا پذیرفت"

بہرحال اس واقعہ (ہندوستانی مدعیانِ علم و فضل کی ہوا خیزی) کی خبر بادشاہ کو پہنچی، اس خبر سے اس کا رنجیدہ ہونا فطری تھا، مزاج شناس وزیر (علامی سعد اللہ خاں) نے نگاہوں کو پہچان لیا اور فوراً ہی بادشاہ سلامت کی گرانئ مزاج کو دور کرنے کے لیے تدبیر سوچ لی، اس اہم کام کی انجام دہی کے لیے ان کی نگاہ انتخاب نے افاضل دربار اور عباقرۂ ملک میں سے ایک شخص کو چن لیا یہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹیؒ کی ذات گرامی تھی، اور بادشاہ کے استمزاج کے بعد ان کو خط لکھا جو کسی پچھلی قسط میں (معارف ستمبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۲۰۷-۲۰۸) نقل ہو چکا ہے،

علامی سعد اللہ خاں کا یہ خط غالباً ربیع الثانی ۱۰۵۷ھ کی شروع کی تاریخوں میں علامہ سیالکوٹی کو پہنچا، انھوں نے اولین فرصت میں اس کی تعمیل شروع کر دی، ربیع الثانی کا پہلا جمعہ ۵ تاریخ کو پڑا، اسی مبارک دن سے انھوں نے مطلوبہ رسالہ تصنیف کرنا شروع کیا،

اور گو کہ علامی سعد اللہ خاں نے اس کار خطیر کی انجام دہی کے لیے دس پندرہ روز [دہ پانزدہ روز] کا وقت دیا تھا، مگر انھوں نے ایک ہفتہ میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا، ایک ساعت سعید [جمعہ کے دن] سے شروع کیا اور دوسری ساعتِ سعید [اگلے جمعہ] کو ختم کر دیا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں :۔

"شارعاً فی تحریرہ ضحوۃ یوم الجمعۃ خامس شہر ربیع الثانی متمماً فی آخر یوم الجمعۃ ثانی عشر منہ من ۱۰۵۶ھ"

مگر فاضل مقالہ نگار نے مصنف کی اس تصریح کو کاتب کا ترقیمہ سمجھا اور ارشاد فرمایا کہ

"خط مولویانہ شکست آمیز صفحات ۲۷، سن ۱۰۵۶ھ کا لکھا ہوا ہے،

اور آگے چلکر اس کی موکد طور پر توضیح کر دی :۔

"ملا صاحب کا انتقال ۱۰۶۰ھ یا ۱۰۶۶ھ میں ہوا ہے، اس لیے یہ رسالہ انکی زندگی ہی کا لکھا ہوا ہے۔" فیا للعجب !

مقالہ نگار نے جان نثار خاں کے بارے میں لکھا ہے :

"عراق میں جان نثار خاں شاہجہاں کی طرف سے کسی خدمت پر مامور تھا محمد فاروق مشرف اور محب علی واقعہ نویس اس کے ہمراہ تھے"۔

انھوں نے "کسی خدمت" کی توضیح نہیں کی، مگر اوپر کی تفصیل اور "بادشاہ نامہ" کی تصریح سے واضح ہے کہ وہ ۱۰۵۶ھ میں سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا، اور یہ دونوں حضرات (محمد فاروق اور محب علی) سفارت خانہ کے عملہ میں اہم خدمات پر مامور تھے، خود علامی سعد اللہ خاں نے جان نثار خاں کی "سفارت" کی تصریح کی تھی، پھر انکے نام سے پہلے "امارت مآب" کا خطاب بالکل ایسا ہی ہے جیسے آج کل سفراء کے نام سے پہلے

"His Excellency" کا خطاب لگا ہوتا ہے، بہر حال سعد اللہ کے الفاظ قابلِ غور ہیں :۔

"محمد فاروق مشرف و محب علی واقعہ نویس کہ بامارت مآب جان نثار خاں سفیر متعین اند" (ملاحظہ ہو معارف ستمبر ۱۹۶۶ء، ص ۲۰۷)

مقالہ نویس نے لکھا ہے :۔

"سلاطین صفویہ کے خاندان کا ایک رکن رکین خلیفہ سلطان ایران سے نکل کر عراق میں آباد ہو گیا تھا۔ پھر وہ ہندوستان چلا آیا، شاہجہانی تاریخوں میں اس کا ذکر متعدد مقامات میں ہے، یہ لائق اور صاحب علم امیر تھا اور وزیر دانشور عراق کے نام سے مشہور تھا" (دیکھئے محلات نظریہ میں سے نمبر ۸، ۹، ۱۰، ۱۱)

مگر یہ تمام باتیں محل نظر ہیں :۔

(الف) خلیفہ سلطان "سلاطین صفویہ کے خاندان کا ایک رکن رکین" نہیں تھا،

(ب) نہ وہ "ایران سے نکل کر عراق میں آباد" ہوا، اور

(ج) نہ وہ "پھر ہندوستان چلا آیا"۔

الف - یہ فاضل مدبر اور وزیر دانشور (خلیفہ سلطان) مازندران کے شاہی خاندان کا ایک شہزادہ تھا، جب شاہ عباس ثانی نے مازندران کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا، تو کچھ تو تالیف قلب کے لیے اور کچھ اس باکمال کے علم و فضل سے متاثر ہو کر اسکے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر کے اسے قلمدان وزارت سونپ دیا، چنانچہ خافی خاں نے اسکے بھائی مرزا قوام الدین کے سلسلے میں لکھا ہے :

"مرزا قوام الدین کہ از برادران خلیفہ سلطان و از سلسلۂ بادشاہ زادہ ہائے مازندران بود"

بعدہٗ کہ مازندران بتسخیر شاہ ایران درآمد، شاہ عباس با خلیفہ سلطان نسبت نمودہ وزیر ساخت"۔ (منتخب اللباب جلد دوم، صفحہ ۲۵۶)

دوسری جگہ (جلد دوم صفحہ ۳۱۱ میں) وہ خلیفہ سلطان کے خاندان کو "سلاطین زادہائے مازندران" بتاتا ہے، نہ کہ "سلاطین صفویہ کے خاندان کا رکن رکین"۔ چنانچہ سید مظفر کے سلسلے میں جو خلیفہ سلطان کے خاندان میں سے تھا، لکھا ہے:-

"سید مظفر کہ از سلسلہ خلیفہ سلطان از سلاطین زادہائے مازندران .... گفتہ می شد"۔

ایک اور جگہ وہ مرزا محمد ہاشم کی آمد کے سلسلے میں خلیفہ سلطان کے حسب ونسب کو بڑی تفصیل سے بیان کرتا ہے:

"مرزا محمد ہاشم نام کہ بہ واسطہ نوائہ شاہ عباس ایران و بہ دو واسطہ نبیرہ خلیفہ سلطان پادشاہ زادۂ مازندران می شد، بعدہٗ کہ مازندران بتصرف شاہ عباس ثانی درآمد، وزارت ایران بخلیفہ سلطان سپردہ صبیۂ خود را بدو دادہ بود"۔

(منتخب اللباب جلد دوم ص ۶۶۳)

نیز خلیفہ سلطان اس وزیر خوش تدبیر کا نام نہیں تھا اور نہ "وزیر دانشور عراق" ہی نام تھا، نام اس کا جو بھی رہا ہو "خلیفہ سلطان" اس کا لقب تھا، عبدالحمید لاہوری نے اس بات کو صاف کر دیا ہے:

"خلیفہ سلطان اعتماد الدولہ کہ لقب وزیر فرمانروائے ایران است"۔ (بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۶۵۹)

اسی طرح "وزیر دانشور عراق" اس کی صفت اور ایک تعریفی و توصیفی کلمہ ہے۔

ب۔ "وزیر دانشور عراق" میں مذکورہ "عراق" سے آج کل کا عراق مراد نہیں ہے جو قدیم مسوپوٹامیا کے مترادف ہے، بلکہ قرون وسطیٰ کے "عراق عجم" سے مراد ہے، جیسا کہ

مذکورۃ الصدر تفصیل سے واضح ہے کہ یہ سفارت اصفہان میں مقیم تھی، یہیں خلیفہ سلطان وزیر دانشور عراق" سے سفارت خانہ کے عملہ کا مناظرہ ہوا تھا، اور اصفہان قرونِ وسطیٰ کے "عراق عجم" کا صدر مقام تھا، اس لیے "ایران سے نکل کر عراق میں آباد ہونے" کا کوئی محل نہیں ہے۔ ایران اور "عراق" (عجم) ایک ہی تھے۔

اسی طرح خافی خاں کی تصریحات سے بھی یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ "خلیفہ سلطان ایران سے نکل کر عراق میں آباد" نہیں ہوا، بلکہ مازندران سے ترک سکونت کرکے اصفہان چلا آیا تھا، جو پایۂ تخت مملکت تھا، اور مازندران بھی ایران ہی کا ایک صوبہ تھا (اور ہے)

ج۔ مقالہ نگار کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ وہ (خلیفہ سلطان) "پھر ہندوستان چلا آیا"۔ اسکے ہندوستان آنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، البتہ اسکے خاندان کے دوسرے افراد بالخصوص اس کے پوتے ضرور آئے،

ان خاندان والوں میں سب سے پہلے ہندوستان میں آنے والا اس کا بھائی مرزا قوام الدین تھا، اور اس کے ایران چھوڑنے کی وجہ برادرانہ ناچاقی تھی، جب بھائی سے نہیں بنی جو اب عہدۂ وزارت پر فائز اور حکومت کے سیاہ و سفید پر متصرف تھا تو اس نے عافیت اسی میں دیکھی کہ ہندوستان چلا آئے، جہاں مغل دربار علماء و فضلا کے ساتھ شرفاء و نجباء کو بھی خوش آمدید کہنے کے لیے تیار تھا، چنانچہ خافی خاں نے لکھا ہے:-

"مرزا قوام الدین کہ از برادران خلیفہ سلطان و از سلسلہ بادشاہ زادہائے مازندران بود ...... چوں میاں برادران موافقت نشد، مرزا قوام الدین رو بہ ہندوستان آوردہ شرف اندوز ملازمت گردید"۔

یہاں آنے کے بعد وہ دیگر اسباب امارت کے ساتھ چار ہزاری دو ہزار سوار کے

منصب سے نوازا گیا، پھر اس پر ہزاری ہزار سوار کا اضافہ ہوا، اور پہلے کشمیر کا پھر لاہور کا صوبہ دار مقرر ہوا، مگر لاہور میں یہاں کے قاضی سے جھگڑا ہو گیا، اس جھگڑے میں قاضی مارا گیا، اس کی پاداش میں قوام الدین معزول ہوا۔

خلیفہ سلطان کے عزیزوں میں دوسرا شخص سید مظفر تھا، جو قطب شاہی دربار (بیجاپور) میں چلا آیا تھا، وہ پہلے ابو الحسن تاناشاہ کے سرگرم حمائیتوں میں تھا، اور اس کی اور اس کے نوکروں کی مدد سے میر احمد کے عزائم کے علی الرغم قطب شاہی تخت پر متمکن ہوا، خافی خاں لکھتا ہے:

"میر احمد از روئے تبحر با امرائے خصوصی بسید مظفر کہ از سلسلۂ خلیفہ سلطان گفتہ می شد...... آخر از اعانت سید مظفر و موسیٰ خاں محلدار و سعی ورد و مادنا داگنا کہ ہر دو برادر نوکر و پیشکاران معتمد سید مظفر بودند ..... میر احمد را مغلوب و بے اختیار و منزوی ساختہ ابو الحسن را سلطنت بر داشتند۔"

(منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۳۱۱)

اس کے صلے میں تاناشاہ نے اسے اپنا وزیر بنالیا، مگر بعد میں یہ خلوص و وداد نفرت و عداوت کی شکل میں بدل گیا اور تاناشاہ نے کسی نہ کسی طرح اس کو عہدۂ وزارت سے معزول کر دیا۔

تیسرا شخص خلیفہ سلطان کا پوتا اور شاہ عباس ثانی کا پرنواسہ تھا، اس کا نام میر علی نقی تھا، وہ عالمگیر اورنگزیب کے عہد ۱۱۰۹ھ میں ایران سے ہندوستان میں وارد ہوا، پہلے بندرگاہ سورت میں آیا، بادشاہ کو اس کی آمد کی خبر ہوئی تو حکم دیا کہ کمال عزت و تکریم کے ساتھ اسے پایۂ تخت میں بھیجا جائے، چنانچہ خافی خاں ۴۲ جلوس کے حالات میں

لکھا ہے:-

"از سوانح بندر سورت بعرض رسید کہ میر علی نقی از نبائر خلیفہ سلطان کہ با بادشاہ ایران نیز رشتہ قرابت قریبہ دارد، بامید بندگی درگاہ آسمان جاہ از ایران رسیدہ حکم شد دو ہزار روپیہ از خزانہ بندر سورت تنخواہ نمایند و مہماندار از حضور تعین فرمودند"

(منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۴۵۶)

چوتھا شخص مرزا محمد ہاشم تھا جو میر علی نقی مذکور الصدر کا چچیرا بھائی تھا، وہ ۱۱۲۱ھ میں بعہد بہادر شاہ اول وارد ہندوستان ہوا، اور میر علی نقی ہی کی طرح آکر بندرگاہ سورت میں اترا، اس کے ساتھ ایک اور ایرانی امیر میر محمد صالح بھی تھا، جو شاہزادہ رفیع الشان کا نانی کی طرف سے رشتہ دار تھا، بادشاہ کو جب اطلاع ملی تو حکم دیا کہ گجرات کا صوبیدار اسے بھی اسی عزت و تکریم کے ساتھ دار السلطنت روانہ کرے، جس طرح عہد عالمگیری میں مرزا قوام الدین کو بھیجا گیا تھا، خافی خاں لکھتا ہے:-

"و از سوانح بندر سورت بعرض رسید کہ مرزا محمد ہاشم نام کہ بہ یک واسطہ نواسہ شاہ عباس ایران و بہ دو واسطہ نبیرہ خلیفہ سلطان ...... می شد...... و محمد صالح نام عموی مومن خاں نجم ثانی کہ با بادشاہزادہ رفیع الشان قرابت جدہ مادری دارد از ایران رسیدہ اند، حکم شد کہ دو گرز بردار و مہماندار برائے آوردن ہر دو با تنخواہ ...... برخزانہ بندر سورت روانہ نمایند۔ و سوائے آں بنام ..... صوبہ دار احمد آباد فرمان صادر شد کہ بعد رسیدن مرزا محمد ہاشم باحمد آباد سرانجام مایحتاج او بدستورے کہ محمد امین صوبہ دار احمد آباد در عہد خلد مکان برائے قوام الدین خاں کہ بنی عم مرزا محمد ہاشم می شد ...... سرانجام نمودہ روانہ حضور ساختہ بود، نماید۔"

(منتخب اللباب جلد دوم ص ۶۶۳)

مقالہ نگار نے لکھا ہے:

"شاہجہانی سفرا، جب عراق گئے تو خلیفہ سلطان سے بھی ملے، ان شاہجہانی سفرا، کو بھی اپنی جگہ دعویٰ فضل و کمال تھا۔" (دیکھئے محلات نظریہ میں سے نمبر ۱۲)

مگر سفیر صرف ایک تھا یعنی "جان نثار خاں"، باقی لوگ بالخصوص وہ جو "خلیفہ سلطان وزیر دانشور عراق سے ملے" اور جنھیں "اپنی جگہ دعویٰ فضل و کمال تھا"۔ سفارت خانہ کے عملہ میں ملازم تھے: ایک صاحب محمد فاروق "مشرف" (سپرنٹنڈنٹ) تھے، اور دوسرے صاحب محب علی "واقعہ نویس" (گویا پریس اتاچی)

مقالہ نگار نے لکھا ہے:-

"ان شاہجہانی سفرا، کو بھی اپنی جگہ دعویٰ فضل و کمال تھا، اور اس کو قائم رکھنا گویا ہندوستان اور سلطنت ہند کی وہ عزت سمجھتے تھے، وزیر نے ان سے دریافت کیا کہ امام غزالی نے ..... شیخ ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر کی ہے، اس کا جواب کیا ہے۔ جان نثار خاں نے شاہجہاں کو اطلاع کی۔"

(دیکھئے محلات نظریہ میں سے نمبر ۱۳ و ۱۵)

مگر فاضل مقالہ نگار کی یہ قیاس آرائی محل نظر ہے کیونکہ اس ادعائے ہمہ دانی کا سلطنت ہند کی عزت و وقار سے کوئی تعلق نہیں تھا، یہ محض سفارت خانہ کے عملے کی بوالفضولی تھی، سفارت صرف کشیدہ تعلقات کو خوش گوار بنانے کے لیے بھیجی گئی تھی، نہ کہ خواہ مخواہ ہندوستانی علم و فضل کی برتری کا جھنڈا گاڑنے کے لیے۔

البتہ جب ان بوالفضولوں کو اس مناظرہ میں منہ کی کھانا پڑی تو پھر ہندوستان کے کھوئے ہوئے علمی وقار کی بحالی کا سوال پیدا ہوا، چنانچہ اس مکتوب کا جو دوسرا نسخہ

"باغستان" میں منقول ہے، اس میں لکھا ہے کہ مناظرہ ہوا اور اس میں ہندوستانی سفارت خانہ کے عملہ کو بری طرح شکست ہوئی:-

"خلیفہ سلطان ...... از محمد فاروق مشرف و محب علی واقعہ نویس .... پس از دعوائے اینان بفضل و کمال پرسید کہ امام غزالی ...... تکفیر ابو نصر فارابی و شیخ ابو علی سینا نمودہ وجہے تاویل کلام حکماء کردہ اند ایں مراتب را تقریر باید کرد۔ مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند و از مسلک معقولیت دور افتادند۔"

اس کے بعد پرچہ نویس نے پوری تفصیل بادشاہ سلامت کی خدمت میں روانہ کی، جس کے بارے میں وزیر اعظم نے اشارہ کیا ہے:-

"حسب الحکم اشرف می نویسد کہ چوں از افراد وقائع ایران بمسامع مجامع رسید ....."

ظاہر ہے اس خبر وحشت اثر سے بادشاہ کا مغموم ہونا فطری تھا اور اسی لیے اسکے استمزاج کے بعد علامی سعد اللہ خاں نے یہ خط لکھا، اور علامہ سیالکوٹی سے استدعا کی:

"لہذا بکمترین مریداں حکم شد کہ باں فضائل و کمالات دستگاہ سطرے چند بنگارد و برگزارد کہ آن افادت و افاضت مرتبہ را دریں مسائل مختصرے جامع و موجزے مفید کہ مستجمع کلمات حکماء و تاویلات علماء ...... باشد ..... نوشتہ در حضرت خلافت در عرصہ دہ پانزدہ روز باید فرستاد کہ بایران فرستادہ شود۔"

فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے:-

"خدا جانے سلاطین کو اس مسئلہ سے کیا دلچسپی تھی۔ چنانچہ اسی کے پس و پیش زمانہ میں امام غزالی کی تہافت الفلاسفہ اور ابن رشد نے جو اس کا جواب تہافت تہافت الفلاسفہ کے نام سے لکھا، سلطان محمد خاں روم نے .... اس پر محاکمہ لکھوایا ہے۔"

(دیکھئے محلات نظریہ میں سے نمبر ۱۶)

اس ارشاد کے آخری حصے پر تبصرہ تو پچھلی قسط میں آچکا ہے، رہا پہلا حصہ تو ابتدا میں شاہجہاں کو اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، مگر جب سفارت خانہ کے ان بوالفضول مدعیان علم و فضل کی اپنے ہاتھوں لائی ہوئی ہوا خیزی سے ہندوستان کا علمی وقار خاک میں ملنے لگا تو پھر ایک بیدار مغز حکمراں کی حیثیت سے شاہجہاں کو اس کی بحالی کی ضرورت کا احساس ہوا، اسی غرض سے یہ رسالہ لکھوایا گیا، چنانچہ علامی سعد اللہ خاں کے مکتوب کے آخری الفاظ اس خیال کے موید ہیں:-

"واں چناں باید بود کہ قابل فرستادن ولائق اضافت بآں فضائل دستگاہ بود

دیر وز گار از اں آثار گویند و در تاریخ ناہا نوشتہ آید"

اور یہ واقعہ ہے کہ علامہ عبد الحکیم سیالکوٹیؒ نے بادشاہ کی اس توقع کو حرفاً حرفاً پورا کیا، ان تاثرات کی تفصیل تو نہیں ملتی جو ایران کے باکمالوں پر اس "درہ ثمینہ" کے مطالعہ سے پیدا ہوئے اور نہ اس انعام و اکرام کی تفصیل کا پتہ چلتا ہے جو اس رسالہ کی ترتیب و تحریر کے صلے میں بادشاہ کی جانب سے علامہ سیالکوٹی کو عطا کیا گیا، لیکن علامی سعد اللہ خاں کی یہ آرزو یقیناً پوری ہوئی: زمانہ میں اسکے نشانات آجتک موجود ہیں اور تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں آج بھی اس کا حوالہ دیا جاتا ہے،

اس طرح ہندوستان کی کلامی عبقریت کا یہ شاہکار ظہور میں آیا، جس کے دیباچہ میں فاضل سیالکوٹی نے لکھا ہے کہ میں نے ان "قواعد عالیہ اور فرائد غالیہ" کو اہل نظر کے مطالعہ کیلئے بادشاہ شاہجہاں کے حکم سے تصنیف کیا ہے:-

یقول العبد المسکین عبد الحکیم ابن شمس الدین: ہذہ قواعد عالیۃ و فرائد غالیۃ نظمتہا لقلوب اولیہ

وأذان واعیۃ بامر الملک المقام..... ابو المظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں صاحب القران الثانی"

مگر ان "قواعد عالیہ و فرائد غالیہ" کا تفصیلی تعارف ایک مستقل بحث چاہتا ہے اور ایک مستقل پیش کش کا مقتضی ہے۔

تصوف اسلامی پر ایک ہندوستانی کتاب

(لطائف اشرفی)

از

جناب ڈاکٹر سید وحید اشرف صاحب شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فارسی میں ملفوظ نگاری زیادہ تر صوفیہ کی مرہون منت رہی ہے، فارسی میں تصوف پر پہلی دو[1] کتابوں میں سے ایک ملفوظات ہی پر مشتمل ہے، جو طبقات الصوفیہ ہروی (امالی شیخ عبد اللہ انصاری ہروی متوفی ۴۸۱ھ) کے نام سے مشہور ہے، لیکن امالی شیخ انصاری بھی ملفوظ کا پہلا نمونہ نہیں ہے اس سے پہلے بھی اس کے نمونے ملتے ہیں[2]، ملفوظ نگاری کی روش ہندوستان میں سب سے زیادہ

---

[1] فارسی میں تصوف کی پہلی کتاب کشف المحجوب قرار دیجاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسکے مؤلف شیخ علی ہجویریؒ کی تاریخ وفات ۴۶۵ھ مشہور ہے جبکہ شیخ عبد اللہ انصاریؒ کی وفات ۴۸۱ھ میں ہوئی لیکن شیخ علی ہجویریؒ نے کشف المحجوب میں شیخ انصاری کے نام کے ساتھ "رحمۃ اللہ علیہ" استعمال کیا ہے جو ایسے اشخاص کے لیے مخصوص ہے جنکا وصال ہو چکا ہو، اس سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ ہجویریؒ ۴۸۱ھ تک بقید حیات تھے اور شیخ انصاریؒ کی وفات آپ سے قبل ہو چکی تھی، ان دونوں بزرگوں کو ایک دوسرے سے ملاقات کا موقع نہیں ملا، اور نہ ایک دوسرے کی کتاب ہی کا انکو علم ہو سکا، کشف المحجوب اور طبقات الصوفیہ ہروی کے صحیح سنہ تالیف بھی نہیں معلوم، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کونسی کتاب مقدم ہے اور کون موخر۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے اورینٹل کالج میگزین لاہور فروری ۱۹۴۰ء، تاریخ وفات ہجویریؒ از عبد الحی حبیبی)

[2] مثلاً امالی ابو علی قالی اور امالی ابو اسحاق زجاج (دیکھئے تاریخ ادبیات ایران، ج اول، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا)

مقبول ہوئی جس کی ابتدا ساتویں صدی ہجری میں حسن سجزی سے ہوئی جنھوں نے سب سے پہلے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات کو فوائد الفواد کے نام سے ترتیب دیا، اگرچہ اس سے پہلے کے بھی کچھ ملفوظ کے نام لیے جاتے ہیں لیکن وہ مشتبہ اور ناقابل اعتبار ہیں، فوائد الفواد کے بعد یہاں بہت سے ملفوظات مرتب ہوئے[1]، آٹھویں صدی ہجری کے تصوف پر اہم ترین کتاب لطائف اشرفی ہے جو حضرت سید اشرف سمنانیؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔

لطائف اشرفی کا پورا نام یوں ملتا ہے: "لطائف اشرفی فی بیان طوائف صوفی"، حالانکہ عربی ترکیب کے اعتبار سے اسے یوں ہونا چاہیے "اللطائف الاشرفیہ فی بیان طوائف الصوفیہ"۔ عام طور پر یہ لطائف اشرفی کے نام سے مشہور ہے، یہ کتاب دو بار ہندوستان میں سید محمد اشرف حسینی اور سید علی حسین اشرفی کچھوچھوی فیض آبادی کی کوششوں سے نصرت المطابع دہلی سے چھپ چکی ہے، پہلی بار ایک جلد میں ۱۲۹۵ھ میں اور دوسری بار دو جلدوں میں ۱۲۹۸ھ میں، جو نہایت مغلوط ہے، اسی مغلوط نسخہ کی بنیاد پر اس کے چند لطائف کا اردو ترجمہ حکیم سید نذر اشرف فاضل کچھوچھوی نے کیا، جسے برکات چشتیہ کے نام سے سید محمد محدث کچھوچھوی نے رسالہ "اشرفی" کچھوچھہ میں بالاقساط شائع کیا تھا، اسی متن کا دوسرا ملخص ترجمہ سیرت الاشرف کے نام سے شائع ہوا، ان ہی نسخوں کی بنیاد پر حضرت سید اشرفؒ کی سوانح حیات پر مشتمل کئی کتابیں بھی مرتب ہوئیں، جو غلط اطلاعات، روایات سے پر اور تحقیق کے معیار سے ساقط ہیں،

اس کتاب کو حضرت سید اشرفؒ کے مرید و خلیفہ نظام الدین یمنی نے مرتب کیا، یمنی نے اپنا نام نظام غریب یمنی بھی لکھا ہے، یمنی کے لفظ سے دھوکا ہوتا ہے کہ آپ یمن کے رہنے والے تھے لیکن قیاس یہ ہے کہ ایران ہی کے باشندہ تھے، یہ ممکن ہے کہ یمنی النسل رہے ہوں، لطائف اشرفی

[1] کچھ ملفوظات کا ذکر پروفیسر خلیق احمد نظامی نے "خیر المجالس" کے مقدمہ میں کیا ہے۔

سے آپ کے بارے میں صرف اس قدر اطلاع ملتی ہے کہ آپ کی ملاقات حضرت سید اشرف سے یمن میں ۷۸۰ھ میں ہوئی اور اسی وقت سے وہ آپ کے ساتھ رہنے لگے[1]، یہاں تک کہ تیس سال کا عرصہ مسلسل آپ کی معیت میں گذرا[2]، یمنی کو فارسی اور عربی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی، لطائف اشرفی کے بعض ابواب اور تمہید آپ ہی کی تصنیف ہیں، آپ فارسی کے خوشگو شاعر بھی تھے، آپ کے متعدد اشعار لطائف اشرفی میں موجود ہیں،

نظام یمنی تمہید میں لکھتے ہیں:-

"مدتی مدید و عہدی بعید قریب سی سال در طریق قویم و سبیل مستقیم آنحضرت در ملازمت معتکفان آستانۂ ارادت و ملازمان جناب مودت ہم کاسہ سگان او می بودم"۔

اس تیس سال سے مراد غالباً ۷۸۰ھ سے ۸۰۸ھ تک کا زمانہ ہے، جو مسلسل سفر میں گذرا، کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی آپ اپنے مرشد کے ساتھ رہے تھے، لطائف اشرفی صرف ۸۰۸ھ تک کے ملفوظات کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اس کے بعد کے بھی ملفوظ اس میں شامل ہیں، نظام یمنی تمہید میں لکھتے ہیں:

"در اثنای این ...... در ضمیر دل ...... التقاکر و کہ بعضی از انفاس نفیسہ و الفاظ متبرکہ و شمہ ای از لطائف معارف و ظرائف کواشف و احوال مقامات شریفہ و انزال کرامات عجیبہ حضرت قدوۃ الکبریٰ از مبتدا تا منتہا اصدار یافت ...... بیان باید کرد"۔

اس میں کچھ ابواب ایسے بھی ہیں جو حقیقت میں حضرت سید اشرف کے ملفوظ نہیں ہیں اور آپ کی وفات کے بعد اضافہ کیے گئے ہیں، لیکن یہ بھی آپ کے اقوال سے بالکل ہی خالی

[1] لطائف اشرفی ج اول ص ۲ [2] ایضاً ج دوم ص ۳۸۱

نہیں ہیں، یہ ابواب آپ کی بیماری اور وفات اور آپکے چند مشہور خلفاء کے تذکروں پر مشتمل ہیں، [1]

یہ کتاب ایک تمہیدی باب، مقدمہ اور ساٹھ ۶۰ ابواب پر مشتمل ہے جنھیں لطائف کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تتمہ بھی تھا جو اب نہیں پایا جاتا،

مکتوبات اشرفی (جو حضرت سید اشرفؒ کے خطوط کا مجموعہ ہے) سے پتہ چلتا ہے کہ لطائف اشرفی ۷۸۲ھ سے قبل اس نام سے وجود میں آچکی تھی اور آپکے ملفوظ کی ترتیب مختلف لطائف کے تحت دیدی گئی تھی، اگرچہ اس میں اضافہ آپ کی وفات اور اسکے بعد تک ہوتا رہا، کیونکہ ان خطوط میں لطائف اشرفی کا جگہ جگہ حوالہ ملتا ہے اور یہ خطوط ۷۸۲ھ کے بعد کے لکھے ہوئے ہیں [2]، ان خطوط میں مریدین کو تصوف اور شریعت کے مسائل میں لطائف اشرفی سے رجوع کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لطائف اشرفی آپ کی زندگی ہی میں ملک کے مختلف حصوں میں پہنچ گئی تھی، آج بھی اگرچہ اس کا کوئی قدیم اور کلیۃً معتبر نسخہ دریافت نہیں ہوسکا ہے لیکن اس کے متعدد نسخے ملک کی مختلف لائبریریوں نیز شخصی ملکیت میں موجود ہیں،

کتاب کی تدوین کا طریقہ یہ تھا کہ اکثر کوئی شخص کوئی مسئلہ پیش کرتا اس کے جواب میں حضرت سید اشرفؒ جو کچھ ارشاد فرماتے نظام یمنی اس کو قلمبند کرلیتے اور حضرت سید اشرفؒ

---

[1] نظام یمنی خود تمہید میں لکھتے ہیں: "تتمۂ بیان سیرت و روش مرضیہ و اصدار مقامات و خوارق عادات حضرت مخدوم زادہ زادہ اللہ تعالیٰ لما اعطاہ وخوارق و ارادت صاحب سجادہ کہ بعد از رحلت حضرت قدوۃ الکبریٰ صادر شدہ در ذیل ایں لطائف شریفہ و ظرایف لطیفہ در آوردم......"

[2] مثلاً مکتوب نمبر ۹، ۱۹، ۳۲، ۴۰ وغیرہ [3] مقدمۂ مکتوبات اشرفی

کے سامنے پیش کردیتے، آپ اس کی تصدیق فرمادیتے یا اس میں کچھ ترمیم کردیتے، اس طرح یہ کتاب آپ کی براہ راست تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے، نظام یمنی تمہید میں لکھتے ہیں:-

"......آنچہ قابل ضبط ذہن و حامل فکر ایں ممتحن بود در قید کتابت آوردہ بنظور اطلاع انظار مخدومی و بحضور استماع احضار معصومی گزرانیدہ و از اول تا آخر ورق ورق بعد گردانیدہ بلکہ اکثر عین الفاظ شریفہ و اقوال صریحۂ ایشان با مضمون منقولہ بنوک قلم رسانیدہ......"

اس کتاب میں بنیادی طور پر تصوف کے مسائل پر بحث ہے لیکن ادبی اور تاریخی اعتبار سے بھی وہ خاص اہمیت کی حامل ہے، تصوف اور شریعت کے مسائل کی تشریح قرآن و حدیث کی روشنی میں کی گئی ہے، اس طرح یہ کتاب اس اصول کی تفسیر پیش کرتی ہے کہ طریقت شریعت سے الگ نہیں، اپنے نظریہ کی تائید میں حضرت سید اشرفؒ نے صوفیہ اور علماء کے اقوال بھی پیش کیے ہیں، متنازعہ مسائل کے بارے میں دلائل کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کی توضیح اور عقیدۂ وحدت الوجود کی پرزور حمایت کی ہے، صوفیہ اور کچھ صوفی شعرا کے تذکروں پر مشتمل الگ الگ باب ہیں، دو ابواب تصوف کی اصطلاحات اور کچھ پیچیدہ صوفیانہ اشعار کی تشریح پر ہیں، اس کتاب سے امراء اور بادشاہوں سے حضرت سید اشرف کے تعلقات پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے، اس طرح یہ کتاب صوفی، عالم، تاریخ ادبیات فارسی اور ہندوستان کے قرن وسطیٰ کی تاریخ کے طالبعلم کیلئے بھی دلچسپ اور مفید ہوگئی ہے،

تصوف اور شریعت کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے قرآن و حدیث، فقہ اور کتب صوفیہ سے دلائل پیش کیے گئے ہیں، بعض تاریخی کتابوں کے حوالے بھی ملتے ہیں، مثلاً تاریخ طبری، طبقات ناصری، اور ترجمہ اردشیر بابک، مباحث کے ضمن میں شعرا کے کلام بھی بکثرت پیش کئے گئے ہیں، ان میں حافظ، سعدی، مولانا روم، نظامی گنجوی، ابوسعید ابی الخیر،

نجم الدین دایہ رازی، عراقی، محمود شبستری کے اشعار زیادہ نظر آتے ہیں، یہ کتاب تصوف کی مستند کتابوں پر مبنی ہے تصوف کی بعض کتابیں اسکے اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں بعض ماخذ کی حیثیت سے دوسرے درجہ پر اہمیت رکھتی ہیں، اور بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن سے کچھ اقتباسات پیش کیے گئے ہیں یا ان کے حوالے دیے گئے ہیں، دوسری اور تیسری قسم کی کتابوں کی ایک طویل فہرست ہے، ان میں سے قابل ذکر یہ ہیں:

بزدوین از ابوالیسر علی بن محمد بزدوی، جامع العلوم از امام فخر رازی، شرح فصوص الحکم از مؤید الدین جندی، نوادر الاصول از محمد بن علی الحکیم ترمذی، اعلام الہدی از شہاب الدین سہروردی (؟)، تالیف حضرت بہاء الدین نقشبندی (کتاب کا نام نہیں دیا ہے)، فوائد الفواد مرتبہ حسن سجزی، مطلع الایمان، شیخ صدر الدین قونیوی، قواعد العقائد امام غزالی، مرصاد العباد نجم الدین دایہ، صفوۃ الصفوۃ ابن جوزی، تذکرۃ الاولیاء عطار، لمعات عراقی وغیرہ۔

وہ کتابیں جو لطائف اشرفی کے اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کا قدرے تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے:

(۱) رسالۂ قشیریہ:۔ تصوف اور تذکرۂ صوفیہ پر بنیادی کتابوں میں سے ایک ہے، جو ۴۳۸ھ میں لکھی گئی، اس کے مولف امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری ہیں۔[1]

[1] عبدالکریم بن ہوازن بن عبدالملک بن طلحہ النیساپوری القشیری، بنی قشیر ابن کعب سے تھے۔ کنیت ابوالقاسم اور زین الاسلام و شیخ خراسان کے القاب سے معروف تھے، سلطان الپ ارسلان آپ کی بہت تعظیم و تکریم کرتا تھا، آپ ابوالمعالی جوینی استاد امام غزالی کے استاد تھے، اور شیخ ابوعلی دقاق کے شاگردوں میں تھے۔ رسالۂ قشیریہ کے علاوہ آپ کی دوسری تصانیف یہ ہیں: لطائف الاشارات، التیسیر فی التفسیر، التفسیر الکبیر۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۳۷۶ھ اور تاریخ وفات ۴۶۵ھ ہے۔ (دیکھئے تاریخ بغداد ۱۱: ۸۳، الدرر الکامنہ ۱: ۳۰۱، نفحات الانس ۳۱۳، لطائف اشرفی لطیفہ پانزدہم)

اس کی کئی حکایات اور بہت سے اقتباسات لطائف اشرفی میں موجود ہیں، اس کتاب میں ۵۴ ابواب اور تین فصول ہیں، ایک فصل تذکرۂ صوفیہ پر مشتمل ہے، جن میں تراسی ۸۳ صوفیہ کے تذکرے ہیں،

رسالۂ قشیری کے فارسی ترجمے بھی پائے جاتے ہیں، اس کا ایک ترجمہ امام قشیری کی زندگی ہی میں ان کے شاگرد خواجہ امام ابوعلی بن احمد عثمانی نے کیا تھا، جس کے قلمی نسخے اب بھی موجود ہیں، اس کی زبان نہایت سقیم ہے، اس لیے اس کے سلیس ترجمہ کی طرف توجہ کی گئی اور چھٹی صدی ہجری میں ابوالفتوح عبدالرحمٰن بن محمد نیشاپوری نے اس کا دوسرا ترجمہ کیا،[1]

اس رسالہ کی کئی شرحیں لکھی گئیں، جن میں سے ایک شرح زکریا انصاری نے "احکام الدلالۃ علی تحریر الرسالۃ" کے نام سے لکھی اور دوسری سدید الدین بن عبد المعطی نے "الدلالۃ علی فوائد الرسالۃ" کے نام سے۔[2] اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہوا ہے جو ۱۹۱۱ء میں شائع ہو چکا ہے،

۲۔ **عوارف المعارف**:۔ یہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیف ہے،[3] یہ کتاب بھی

[1] دیکھئے تاریخ ادبیات ایران ج اول از ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا [2] القاموس الاسلامی ج ۲ از احمد عطیۃ اللہ

[3] شہاب الدین سہروردی کے نام سے دو شخصیتیں مشہور ہیں، ایک عوارف المعارف کے مصنف شیخ الاسلام شہاب الدین عمر (۵۳۹ھ۔ ۶۳۲ھ)، دوسرے شہاب الدین ابوالفتح یحییٰ بن حبش بن امیرک جو شیخ اشراق اور شیخ مقتول کے نام سے مشہور ہیں، ان کا شمار چھٹی صدی ہجری کے اشراقی حکماء میں ہوتا ہے، اپنے فلسفیانہ افکار کے جرم میں ۵۸۷ھ میں قتل کر دیے گئے، کتاب حکمۃ الاشراق، تلویحات، مطارحات، ہیاکل النور آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ (دیکھئے وفیات الاعیان ۲: ۲۶۱، مراۃ الجنان ۳: ۴۳۴، اعلام النبلاء ۴: ۲۹۲ وغیرہ)

(باقی حاشیہ ص ۱۲۶ پر)

تصوف اسلامی پر بنیادی اہمیت کی حامل ہے، صوفیہ کے تمام حلقوں میں پڑھی پڑھائی جاتی ہے، اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، حضرت سید اشرفؒ نے بھی اس کی شرح لکھی تھی، آپ نے اس کتاب کے فارسی ترجمے بھی پڑھے تھے، مثلاً عزالدین محمود کاشانی کا ترجمہ موسوم بہ مصباح الہدایہ و مفتاح الکفایہ اور نجیب الدین علی بن مزغش شیرازی کا ترجمہ معارف العوارف۔ اول الذکر ترجمے سے لطائف اشرفی میں بہت استفادہ کیا گیا ہے، جس کا ذکر آئے گا۔

ان دونوں ترجموں کے علاوہ بھی اس کتاب کے متعدد ترجمے ہوئے ہیں، جن میں سے دو سب سے زیادہ قدیم ہیں، ایک ترجمہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی وفات کے دس سال کے اندر اُچہ میں ہوا، اور دوسرا تینتیس[۳۳] سال بعد غالباً اصفہان میں ہوا،

اول الذکر ترجمہ سب سے قدیم ہے، مترجم کا نام قاسم داؤد ہے، یہ ترجمہ سلطان تاج الدین ابوبکر

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۵) شیخ شہاب الدین سہروردی کا شمار بزرگ ترین صوفیہ میں ہوتا ہے، آپ شافعی مسلک کے پیرو تھے، سلسلۂ نسب خلیفۂ اول تک پہنچتا ہے، اپنے چچا شیخ عبدالقاہر ابوالنجیب سہروردی (م ۵۶۳ھ) سے علوم ظاہری اور باطنی کی تعلیم حاصل کی، اس کے علاوہ فقہ اور حدیث میں ابوالقاسم بن فضلان و ابوالمظفر ہبۃ اللہ و معمر بن فاخر و ابوزرعہ مقدسی اور ابوالفتوح طائی وغیرہ سے بھی تلمذ حاصل ہے، طریق تصوف میں شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ) اور شیخ ابوالسعود بغدادی (م ۵۷۹ھ) سے بھی فیض حاصل کیا، شیخ سعدی آپ کے معتقدین میں تھے، عوارف المعارف آپ کی مشہور ترین تصنیف ہے، اس کے علاوہ آپ کا ایک رسالہ "جذب القلوب الی مواصلۃ المحبوب" بھی طبع ہو چکا ہے، دوسری تصانیف "نخبۃ البیان فی تفسیر القرآن" اور "السیر و الطیر" (رسالہ) ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ (دیکھئے وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۸۰، شذرات ج ۵ ص ۱۵۳، طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۴۳ وغیرہ)

(۶۳۹ھ۔ ۶۴۳ھ) کے حکم اور شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا الملتانی (م ۶۵۶ھ) کی اجازت سے بظاہر ۶۴۰ھ اور ۶۴۲ھ کے درمیان اُچہ میں ہوا، جو تاج الدین ابوبکر کا مستقر تھا، اس ترجمہ کا واحد نسخہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں ہے،

دوسرا قدیم ترجمہ ۶۶۵ھ میں ہوا، مترجم کا نام اسمٰعیل بن عبدالمومن بن ابی منصور اصفہانی ہے، اس کا واحد نسخہ برٹش میوزیم میں نئے حاصل کیے ہوئے مخطوطات میں ہے، مترجم شیخ المشائخ زین الدین حجۃ الاسلام عبدالسلام کا مرید تھا، یہ مخطوطہ ۱۲۳ اوراق پر مشتمل اور ۶۳ ابواب (اتنی ہی تعداد عوارف میں بھی ہے) میں منقسم ہے،[۱]

عوارف المعارف کا ایک ترجمہ ظہیر الدین عبدالرحمٰن بن نجیب الدین مزغش شیرازی (م ۷۱۶ھ) کے پوتے جنید بن فضل اللہ نے بھی کیا تھا جس کا ایک مخطوطہ برلن میں ہے،[۲]

(۳) **طبقات الصوفیہ** ۔ اس نام کی متعدد کتابوں کا ذکر ملتا ہے، جن میں سے دو سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ایک عربی میں عبدالرحمٰن سُلمی[۳] کی تالیف ہے اور دوسری

[۱] دیکھئے فکر و نظر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جولائی ۱۹۶۳ء "عوارف المعارف کے قدیم فارسی ترجمے" از پروفیسر نذیر احمد [۲] کیٹلاگ مخطوطات فارسی دانشگاہ کیمبرج ص ۸۰ [۳] محمد بن حسین بن محمد بن موسیٰ ازدی السلمی نیشاپوری، کنیت ابوعبدالرحمٰن، خراسان کے مشہور مفسر، محدث اور صوفی تھے، ۳۲۵ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے اور ۴۱۲ھ میں وفات پائی، ۳۵۰ھ کے بعد پچاس سال سے زیادہ عرصہ تالیف و تصنیف میں گزارا، تصانیف کی تعداد ایک سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے، جن میں سے حسب ذیل چھپ چکی ہیں، طبقات الصوفیہ (۳۵۰ھ کے بعد کی تالیف ہے)، کتاب الاربعین فی الحدیث اور رسالۃ الملامتیہ، دوسری تصانیف یہ پائی جاتی ہیں :- حقائق التفسیر، مقدمہ فی التصوف، مناہج العارفین، رسالہ فی غلطات الصوفیہ، آداب الفقر و الشرائط، بیان زلل الفقراء، و مناقب اہل الہم، الفتوۃ، آداب الصحبۃ (باقی ص ۱۲۸ پر)

فارسی میں ابواسمٰعیل[1] عبداللہ انصاری کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، جسے ان کے کسی مرید ابن البنار نے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۷) السؤالات، سلوک العارفین، عیوب النفس ومداواتہا، الفرق بین الشریعۃ والحقیقۃ، آداب الصوفیہ، درجات المعاملات۔ (دیکھئے طبقات الصوفیہ مقدمہ نورالدین شریبہ، مفتاح السعادۃ ج۱ ص ۵۱۴، میزان الاعتدال ج۳ ص ۴۳، تاریخ بغداد ج۲ ص ۲۴۸)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] شیخ الاسلام ابواسمٰعیل عبداللہ بن ابی منصور محمد الانصاری ہروی ۲ شعبان ۳۹۶ھ کو ہرات میں پیدا ہوئے، اور ۲۲ ذی الحجہ ۴۸۱ھ میں وہیں وفات پائی، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاریؓ تک پہنچتا ہے، جو حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہرات میں سکونت پذیر ہوگئے تھے، آپ کا شمار خراسان کے بزرگ ترین صوفیہ اور علماء میں ہوتا ہے، خود آپکے قول کے مطابق آپ کو تین لاکھ حدیثیں ہزار ہزار اسناد کے ساتھ یاد تھیں جنھیں آپنے تین سو محدثین سے نقل کیا تھا، آپنے نیشاپور کے قاضی ابوبکر حیری سے کوئی حدیث صرف اسلیے قبول نہیں کی کہ وہ متکلم اور اشعری مسلک سے تعلق رکھتے تھے، علم تفسیر میں آپ خواجہ امام یحییٰ عمار کے شاگرد تھے، خود فرماتے ہیں کہ اگر خواجہ عمار نہ ہوتے تو علم تفسیر میں لب کشائی نہیں کر سکتا تھا، جب آپ کی عمر چودہ سال کی تھی خواجہ عمار نے آپکے بارے میں فرمایا تھا "ازوی بوی امامی می آید"۔ آپ کو کم وبیش ایک لاکھ اشعار شعراء عرب کے زبانی یاد تھے، تحصیل علم سے شغف کا یہ عالم تھا کہ صبح کو ناشتہ کر کے مطالعہ وتحریر میں اس طرح غرق ہوجاتے کہ اکثر کھانے کا خیال نہ رہتا اور تحریر کے دوران آپ کی ماں آپ کے منہ میں لقمہ ڈالتی تھیں، عربی اور فارسی میں متعدد تصانیف اور اشعار آپ سے منسوب ہیں، بعض تالیفات ملفوظ کی شکل میں مدون ہوئیں، ان میں سے ایک طبقات الصوفیہ ہروی ہے، آپ کی تفسیر قرآن کشف الاسرار وعدۃ الابرار بھی چھپ چکی ہے۔ (نفحات الانس، بتصحیح مہدی توحید پور ص ۳۳۱، طبقات الصوفیہ ہروی مقدمہ عبدالحی حبیبی)

جمع کیا؛ یہاں موخر الذکر سے مراد ہے۔ لطائف اشرفی میں اس کتاب سے بہت زیادہ استفادہ کیا گیا ہے،

طبقات الصوفیہ ہروی بھی تصوف کی بہت سی کتابوں پر مبنی ہے، اس کا اصل ماخذ طبقات الصوفیہ سلمی ہے، لیکن جن دوسری کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے انکی تفصیل یہ ہے: تاریخ سلمی، کتاب زہد از سہل بن عاصم، کتاب احمد بن الحواری، جزو در نکتہ ہای توحید از ابوسعید ابن الاعرابی، محبت الظرائف از ابوعمر نوقانی، اعتقاد از ابراہیم خواص، اسمای مشائخ فارس از ابوعبداللہ خفیف، لمع ابوبکر مفید، نہج الخاص وکتاب نعوت، واربعین صوفیان از ابومنصور معمر اصفہانی، اربعین مشائخ از شیخ بوسعید مالینی، مقامات شیخ الاسلام انصاری (یہ شیخ انصاری کی تالیف تھی جس کے بہت سے مضامین ابن رجب نے طبقات الصوفیہ میں شامل کر دیے تھے) تاریخ وحکایات از ابوبکر محمد سکندری معاصر شیخ الاسلام ومتوفی ۴۸۲ھ، سیرت شیخ کبیر ابوعبداللہ محمد بن الخفیف متوفی ۳۷۱ھ تالیف ابوالحسن علی بن محمد دیلمی شاگرد ابن خفیف، یہ کتاب اواخر قرن چہارم میں لکھی گئی اور فارسی میں اس کا ترجمہ رکن الدین یحییٰ بن جنید شیرازی نے کیا[1]،

(۴) **کشف المحجوب**۔ تصوف کی اہم ترین کتابوں میں ہے، شیخ علی ہجویری[2] کی تالیف ہے۔

[1] طبقات الصوفیہ ہروی، مقدمہ عبدالحی حبیبی [2] ابوالحسن علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی الہجویری الغزنوی قرن پنجم ہجری کے کبار صوفیہ میں سے تھے، طریقت میں ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی کے شاگرد تھے، ابوالعباس شقانی سے بھی کسب علم کیا، شقانی ان مشائخ میں سے تھے جو منصور حلاج کے طرفدار تھے اور جلابی نے بھی منصور حلاج کی پرزور حمایت کی ہے، آپنے ابوالقاسم گرگانی، ابوالقاسم قشیری اور ابو احمد المظفر بن حمدان سے بھی فیض صحبت حاصل کیا تھا، کشف المحجوب آپ کا آخری شاہکار ہے،

(باقی حاشیہ ص ۱۳۰ پر)

لطائف اشرفی کے بعض ابواب کشف المحجوب ہی کے بیان پر مبنی ہیں، یہ کتاب ابوسعید ہجویری کی استدعا پر لکھی گئی تھی، اس کتاب کی تصنیف میں قرآن وحدیث کے علاوہ بہت سے صوفیائے کرام کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، اور ان کے حوالے دیے ہیں، مثلاً تاریخ اہل صفہ از عبدالرحمن سلمی، طبقات الصوفیہ سلمی، کتاب سماع سلمی، رسالۂ قشیریہ، کتاب محبت عمرو عثمان مکی، کتاب اللمع ابونصر سراج، تاریخ المشائخ محمد بن علی ترمذی، تصانیف پنجاہ گانہ حسین بن منصور حلاج، تصحیح الارادہ جنید بغدادی، کتاب رعایت حارث محاسبی وغیرہ[۱]

(۵) **احیاء العلوم**:- یہ امام غزالی[۲] کی مشہور ترین تصنیف ہے، یہ کتاب دمشق یا بیت المقدس

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۹) اس کتاب سے آپ کے متعدد منثور و منظوم آثار کا پتہ چلتا ہے، جن کی تفصیل یہ ہے۔
دیوان شعر، کتاب فنا و بقا، اسرار الخلق والملونات، الرعایہ بحقوق اللہ تعالیٰ، کتاب البیان لاہل العیان، نحو القلوب، منہاج الدین، ایمان، فرق فرق۔ (کشف المحجوب مقدمہ ژوکوفسکی)
(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱ کشف المحجوب مقدمہ ژوکوفسکی۔ ۲ امام ابو حامد محمد غزالی طوسی ۴۵۰ھ میں طوس میں پیدا ہوئے، والد محمد بن محمد بافندگی کا پیشہ کرتے تھے، ان کے دوسرے بیٹے کا نام احمد تھا، باپ کی وفات کے بعد ان دونوں نے ابو حامد احمد بن محمد رادکانی کے زیر تربیت تعلیم پائی، پھر امام الحرمین ابو المعالی جوینی شافعی کی شاگردی اختیار کی، چونتیس سال کی عمر میں ۴۸۴ھ سے چار سال تک بغداد میں مدرسۂ نظامیہ میں درس دیتے رہے، پھر یہ مشغلہ ترک کرکے دس سال تک شام و حجاز اور بیت المقدس میں رہے اور زہد و ریاضت اور تالیف و تصنیف میں مصروف رہے، احیاء العلوم اسی سفر کی یادگار ہے، ۴۹۹ھ میں طوس واپس ہوئے اور سلطان سنجر کی درخواست پر نیشاپور میں درس دینا منظور کر لیا، لیکن دو سال کے بعد پھر درس و تدریس ترک کرکے طوس میں عزلت نشین ہو گئے اور وہیں ۵۰۵ھ میں وفات پائی۔ (دیکھئے غزالی نامہ جلال ہمائی، تاریخ ادبیات ایران ج اول ذبیح اللہ صفا، الغزالی شبلی نعمانی وغیرہ)

میں شام اور بیت المقدس کے سفر میں لکھی گئی، یہ چار حصوں میں منقسم ہے، عبادات، عادات، مہلکات اور منجیات، ہر حصے میں دس فصلیں ہیں، شروع ہی سے اس کتاب کے مخالفین اور موافقین کی جماعتیں پیدا ہونا شروع ہو گئیں، اس کتاب کی تلخیص، شرح، اس پر اعتراضات اور اعتراضات کے جواب میں متعدد کتابیں لکھی گئیں، اس کا خلاصہ سب سے پہلے خود امام غزالی نے المرشد الامین الی موعظۃ المتقین کے نام سے کیا، اس کے بعد ان کے بھائی احمد غزالی نے لباب الاحیاء کے نام سے اس کا خلاصہ کیا، پھر متعدد خلاصے لکھے گئے۔

اس کتاب پر اعتراضات کے جواب میں سب سے پہلے خود امام غزالی نے کتاب الاملاء علی مشکل الاحیاء اور کتاب الانتصار لما فی الاحیاء من الاسرار لکھیں، اس کے بعد قطب شعرانی نے کتاب الاجوبۃ المرضیہ، ابن قیم کے اعتراضات کے جواب میں لکھی،

اس کتاب کی تائید میں اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، اس کی نقل کردہ احادیث کی شرح میں امام زین الدین ابوالفضل عبدالرحیم بن حسین عراقیؒ نے حمل الاسفار لکھی، ان کے شاگرد شہاب الدین ابن حجر عسقلانی نے اس پر استدراک لکھا، تحفۃ الاحیاء فیما فات من تخریج الاحادیث الاحیاء از شیخ قاسم حنفی، کتاب اتحاف السادات المتقین از سید محمد حسینی معروف بہ مرتضیٰ زبیدی (۱۱۴۵ھ - ۱۲۰۵ھ) (یہ کتاب دو بار قاہرہ سے طبع ہو چکی ہے، پہلی بار تیرہ جلدوں میں اور دوسری بار دس جلدوں میں) کتاب روح الاحیاء از ابن یونس وغیرہ لکھی گئی۔[۵]

(۶) **فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ**: یہ دونوں کتابیں شیخ محی الدین اکبر[۶] (م ۶۳۸ھ)

۵ غزالی نامہ جلال ہمائی ۶ محمد بن علی بن محمد ابن العربی، ابوبکر الحاتمی الطائی الاندلسی، المعروف محی الدین، الملقب بشیخ اکبر، مرسیہ میں ۵۶۰ھ میں پیدا ہوئے، وہاں سے اشبیلیہ آئے اور شام،
(باقی حاشیہ ص ۱۳۲ پر)

کی تصانیف ہیں، اور دونوں تصوف کی اہم ترین کتابوں میں ہیں، فتوحات مکیہ ضخیم کتاب ہے، جو ۶۲۹ھ میں تکمیل کو پہنچی، فصوص الحکم وحدۃ الوجود پر عقیدہ رکھنے والے صوفیوں کے لیے تصوف اسلامی پر بنیادی کتاب ہے، اس کتاب کے متعلق بھی صوفیہ میں بڑے اختلافات رہے ہیں، اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، اس کتاب پر مبنی حضرت سید اشرفؒ نے ایک کتاب مرأۃ الحقائق کے نام سے تالیف کی تھی جواب ناپید ہے، نظام یمنی نے اس کتاب کے کچھ اجزاء لطائف اشرفی میں اصطلاحات صوفیہ کے نام سے شامل کیے ہیں، اس کے علاوہ بھی اس سے متعدد جگہ استفادہ کیا گیا ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۱) روم، عراق و حجاز کا سفر کیا، آپ کے بعض شطحیات کی وجہ سے آپ کے بہت سے مخالفین پیدا ہوگئے جس کی وجہ سے آپ کو قید و بند کی مصیبت جھیلنی پڑی، پھر ایک شخص علی بن فتح البجائی کی کوششوں سے قید سے رہا ہوئے، اس کے بعد دمشق میں مقیم ہوگئے اور وہیں وفات پائی۔ نسبت ارادت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے حاصل کی، آپ کا شمار ائمۂ متکلمین میں ہوتا ہے، ذہبی نے آپ کو قدوۃ القائلین بوحدۃ الوجود لکھا ہے، آپ کی تصنیفات کی تعداد باختلاف روایت چار سو سے پانسو تک پہنچتی ہے۔ جن میں سے مندرجۂ ذیل کتابیں طبع ہو چکی ہیں:-

(۱) الفتوحات المکیہ (دس جلدوں میں) (۲) محاضرۃ الابرار و مسامرۃ الاخیار (دو جلدوں میں) (۳) دیوان شعر (۴) فصوص الحکم (۵) مفاتیح الغیب (۶) التعریفات (۷) عنقاء مغرب (۸) انشاء الدوائر (۹) کنہ ما لا بد للمرید منہ (۱۰) مواقع النجوم و مطالع اہلۃ الاسرار والعلوم (۱۱) الانوار (۱۳) شجرۃ الکون (۱۳) فتح الذخائر والاغلاق (۱۴) عقلۃ المستوفز (۱۵) التجلیات (۱۶) الاربعون صحیفۃ من الاحادیث القدسیہ۔ (دیکھئے فوات الوفیات ج ۲ ص ۲۴۱، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۰۸، لسان المیزان ج ۵ ص ۳۱۱، شذرات الذہب ج ۵ ص ۱۹۰، مرأۃ الجنان ج ۴ ص ۱۰۰

(۷) ترجمۂ عوارف:- اس سے مراد مصباح الہدایہ و مفتاح الکفایہ ہے، اگرچہ اس کتاب کا نام لطائف اشرفی میں نہیں ملتا لیکن لطائف اشرفی کا اس کتاب سے مقابلہ کرنے پر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ترجمۂ عوارف سے مراد ترجمۂ عزالدین[۵] محمود کاشانی ہے جو مصباح الہدایہ و مفتاح الکفایہ کے نام سے موسوم ہے، اس کے بعض ابواب کی عبارتیں لطائف اشرفی میں لفظ بلفظ ملتی ہیں،

مصباح الہدایہ کا ذکر عوارف المعارف کے فارسی ترجمہ کی حیثیت سے کیا جاتا ہے، لیکن دراصل یہ کتاب اس کا براہ راست ترجمہ نہیں ہے، بلکہ اس کے اکثر مضامین اس میں شامل ہیں، کہیں صرف ترجمہ ہے اور کہیں اس کے مطالب کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، کہیں ایجاز ہے اور کہیں اطناب، شیخ سہروردی کی بیان کردہ حکایات اور روایات کو بھی اکثر نظر انداز کر دیا گیا ہے، کتاب کی ترتیب اور فصول کے قائم کرنے کا طرز بھی جداگانہ ہے،

---

[۵] شیخ عزالدین محمود بن علی کاشانی (م ۷۳۵ھ) کا شمار ایران کے آٹھویں صدی ہجری کے مشہور علماء و صوفیہ میں ہوتا ہے۔ آپ سہروردی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور مشہور بزرگ نورالدین عبدالصمد ابن علی الاصفہانی نطنزی (م ۶۹۹ھ) کے شاگرد اور خلیفہ ہیں، آپ نے شیخ ظہیرالدین عبدالرحمن ابن شیخ نجیب الدین علی بن بزغش شیرازی (م ۷۱۶ھ) سے بھی فیض صحبت حاصل کیا۔ (نفحات الانس، تصحیح مہدی توحیدی پور، ص ۴۸۱)

شیخ نورالدین عبدالصمد اور شیخ ظہیرالدین عبدالرحمن دونوں ہی شیخ نجیب الدین علی بن بزغش شیرازی کے شاگردوں میں سے تھے۔ اور شیخ نجیب الدین شیخ شہاب الدین سہروردی (۵۳۹ھ - ۶۳۲ھ) کے شاگردوں میں سے تھے۔

(نفحات الانس ص ۴۸۰، ۴۸۲، ۴۷۳)

(۸) **چہل مجلس اور العروہ**:۔ العروہ کا پورا نام العروہ لاہل الجلوہ والخلوہ ہے، یہ شیخ علاء الدولہ سمنانی[1] کی تصنیف ہے، جو ۷۲۴ھ میں لکھی گئی، چہل مجلس شیخ علاء الدولہ سمنانی کے

---

[1] احمد بن محمد بن احمد بن محمد بیابانکی ملقب بہ علاء الدولہ ورکن الدین وابوالمکارم، سمنان کے ایک قریہ بیابانک میں ذی الحجہ ۶۵۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۷ سال کی عمر میں ۲۲ رجب ۷۳۶ھ کو وفات پائی، اور سمنان کے قریہ صوفی آباد میں مدفون ہوئے، ان کے والد محمد ملقب بہ ملک شرف الدین غازان خان (۶۹۴ھ۔۷۰۳ھ) کے عہد حکومت میں ذی الحجہ ۶۹۴ھ سے ذیقعدہ ۶۹۵ھ تک وزارت کے عہدہ پر فائز رہے، چچا ملک جلال الدین اور ماموں رکن الدین صائن، ارغون خاں (۶۸۳ھ۔۶۹۰ھ) کے ندماء میں تھے، پندرہ سال کی عمر میں شیخ علاء الدولہ اپنے چچا ملک جلال الدین کے توسط سے ارغون خاں کے دربار میں داخل ہوئے اور دیوانی کے فرائض انجام دینے لگے، اپنی لیاقت اور فرض شناسی کے سبب بادشاہ کے خاص منظور نظر ہوگئے، ۶۸۳ھ میں ۲۴ سال کی عمر میں شاہی ملازمت ترک کرکے راہ سلوک اختیار کی، ۶۸۵ھ میں شیخ عبدالرحمن اسفرائینی سے نسبت ارادت حاصل کی، آپ کا شمار وقت کے مشاہیر صوفیہ میں تھا، اپنے بارے میں خود فرماتے ہیں:۔

ہر رند کہ در مصطبہ مسکن دارد	بوی زمن سوختہ خرمن دارد
ہر جا کہ سیہ گلیم و آشفتہ دلی ست	شاگرد من است و خرقہ از من دارد

آپ کی متعدد منثور و منظوم تصنیفات ہیں، الدرر الکامنہ میں آپ کی تصانیف کی تعداد تین سو تک بتائی گئی ہے، جن میں سے صرف یہ کتابیں پائی جاتی ہیں:۔

(۱) مطلع النطق و مجمع اللفظ (عربی) اس میں قرآن کی بعض سورتوں کی تفسیر صوفیانہ انداز میں کی گئی ہے، (۲) سرالبال فی اطوار سلوک اہل الحال (فارسی) مختصر رسالہ ہے، (۳) سلوۃ العاشقین (فارسی) ایک مختصر رسالہ ہے (۴) مشارع ابواب القدس و مراتع الانس (عربی) اسکا موضوع حکمت و کلام ہے۔

(باقی حاشیہ ص ۱۳۵ پر)

ملفوظات کا ایک مختصر مجموعہ ہے، جسے انکے مرید شیخ اقبال سیستانی نے جمع کیا، اپنی ابتدائی زندگی میں حضرت سید اشرف خود شیخ علاء الدولہ سمنانی کی صحبت میں رہ چکے تھے، اور آپ نے ان سے سلوک کی تعلیم بھی حاصل کی تھی، لطائف اشرفی میں شیخ علاء الدولہ کے جو اقوال و بیانات ہیں وہ شیخ کی دونوں مذکورہ کتابوں میں لفظ بلفظ ملتے ہیں، اگرچہ ان دونوں کتابوں کا کہیں نام نہیں لیا گیا ہے، البتہ العروہ کا نام صرف ایک جگہ آپ کے مکتوب میں ملتا ہے۔

(۹) **روض الریاحین فی حکایات الصالحین**:۔ یہ امام عبد اللہ یافعی[1] کی تصنیف ہے، لطائف اشرفی میں صرف مصنف کا نام لیا ہے، تصنیف کا نام نہیں بتایا گیا ہے لیکن لطائف اشرفی اور روض الریاحین کے تقابلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ امام یافعی کی کتاب سے مراد روض الریاحین ہی ہے، اس کتاب کے اقتباسات لفظ بلفظ لطائف اشرفی میں ملتے ہیں،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۴) (۵) مناظر المحاضر للمناظر الحاضر (عربی) یہ رسالہ واقعۂ غدیر خم وغیرہ پر لکھا گیا ہے، (۶) العروہ لاہل الجلوہ والخلوہ (فارسی) تصوف پر ہے، (۷) چہل مجلس (فارسی) ملفوظات کا مختصر مجموعہ ہے۔ (دیکھئے العروہ فصل اول باب ششم، تاریخ گزیدہ تلخیص و ترجمۂ انگریزی از براؤن ص ۴۴، حبیب السیر ج ۳ ص ۲۰۴، الدرر الکامنہ ابن حجر عسقلانی، شرح احوال علاء الدولہ سمنانی از سید مظفر حیدر وغیرہ)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] عبد اللہ ابن اسعد بن علی الیافعی عدن میں پیدا ہوئے، یافعی بنی یافع سے منسوب ہے، آپ شافعی مسلک کے پیرو تھے، ۷۶۸ھ میں وفات پائی، حضرت سید اشرف نے آپ سے ملاقات کی تھی اور علمی استفادہ بھی کیا تھا، آپ کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

مرآۃ الجنان، درر النظیم فی بیان فضائل القرآن العظیم، نشر المحاسن الغالیہ فی فضل المشائخ الصوفیہ واصحاب المقامات العالیہ، اسنی المفاخر فی مناقب شیخ عبد القادر اور روض الریاحین فی حکایات الصالحین۔

(دیکھئے الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۲۴۷، شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۱۰، طبقات شافعیہ ج ۶ ص ۱۰۳ وغیرہ)

میر حسین شاہ حقیقت

حالات و تصنیفات

از جناب ڈاکٹر لطیف حسین صاحب ادیب

(۲)

جذب عشق حقیقت کے بڑے بھائی سید محمد حسن شاہ ضبط نے فارسی زبان میں ایک کہانی ۱۲۰۴ھ (۱۷۹۰ء) میں لکھی تھی، حقیقت نے محمد حسن شاہ کے ارشاد کے مطابق اس کہانی کو ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں اردو میں منتقل کیا، مادہ تاریخ "ہے یہ جذب عشق آہ" (۱۲۱۲ھ) سے برآمد ہوتا ہے۔

جذب عشق طباعت سے محروم رہی، اس کا قلمی نسخہ سید مسعود حسن رضوی ادیب (دین دیال روڈ، لکھنؤ) کے کتب خانے میں محفوظ ہے، حقیقت نے سبب تالیف کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ

"زمانے میں سلطنت شاہ عالم بادشاہ غازی کے ..... سنہ بارہ سے چار ہجری نبوی میں درمیان سمیری کے جو مضافات پرگنہ بندرابن سے متصل قصبہ جہا تا ہے، واقع ہوا، اور مفصلاً اخوی صاحب و قبلہ ...... حقائق و معارف آگاہ جناب سید محمد حسن شاہ نے اس قصے کی معشوقہ کو بہ ساخۂ پیرایۂ الفاظ رنگین فارسی کے مجلس ظہور میں جلوہ افروز ناز کا کیا، ایک روز کمال سرفرازی اور مہر سے جو بزرگوں کو خوردوں کے حال پر ہمیشہ

مبذول ہے، اس کمترین عقیدت گزیں کو زبان معنی بیان سے فرمایا کہ چہرۂ معشوقۂ زیبا نگار اس مضمون عبرت مشحون کو ساتھ حلیہ نور (و) زیور عبارت نثر زبان اردو کے تحفہ مجلس احباب کا کرے۔ سو بنا بر فرمان واجب الاذعان اور یمین انفاس متبرکہ اسی جناب کے ع

درفکر سے گوندھ لڑیاں گئی

ساتھ عبارت سلیس، رنگین اور دلچسپ کے ترتیب دیکر ساتھ جذب عشق کے موسوم کیا اور موافق خواہش قصے اور تقاضے عبارت کے اشعار آب دار اپنے اور استادوں کے درج کئے۔" (از صبح نوٹینہ ص ۹ ستمبر ۱۹۶۵ء)

گویا حقیقت نے اصل قصے کو سلیس، رنگین اور دلچسپ عبارت میں ترتیب دیا اور حسب موقع اپنے اور اساتذہ کے اشعار درج کیے، اس طرح ترجمے میں طبعزاد کہانی کا لطف پیدا ہوگیا اور وہ مستقل تالیف معلوم ہونے لگی،

جذب عشق ایک سچی عشقیہ کہانی پر مشتمل ہے، ایک خوبرو سپاہی، جو مرہٹوں کی قید میں تھا، بھوانی کے میلے میں ایک حسینہ پر عاشق ہو جاتا ہے، حسینہ بھی اظہار التفات کرتی ہے، دونوں میں خفیہ ملاقاتیں ہوتی ہیں، راز کے افشا ہونے پر حسینہ کے اعزا، سپاہی پر مسلح یورش کرتے ہیں، سپاہی مقابلہ کرتا ہے اور لڑتے لڑتے ایک تالاب میں جا پڑتا ہے، وہ فن پیراکی سے ناواقفیت کی بنا پر ڈوب کر مرجاتا ہے، بعد کو حسینہ بھی اسی تالاب میں کود کر جان دیدیتی ہے، دونوں کی ہم آغوش لاشیں تالاب سے برآمد ہوتی ہیں، لوگ انھیں نکالنا چاہتے ہیں مگر وہ غائب ہو جاتی ہیں، اور تلاش کے باوجود نہیں ملتی ہیں۔ (از صبح نوٹینہ ص ۱۰ ستمبر ۱۹۶۵ء)

یہ کہانی مشرقی عشقیہ تصور کے مطابق ہے، در اصل اس کی اہمیت دو وجوہ سے ہے، یہ مختصر کہانی اردو کی ضخیم داستانوں اور انیسویں صدی کے ناولوں کے درمیانی عہد کی ہے، کیا اس کہانی نے

یا دیگر منثور و منظوم قصوں نے اردو ناول کی تشکیل میں حصہ لیا ہے؟

اس کہانی میں فوق فطرت عنصر نہیں ہے، زبان سلیس اور عام فہم ہے، اس کے کردار عام انسانوں سے مشابہ ہیں، طوالت نہیں ہے، اختصار ہے، اس طرح یہ کہانی دوسری داستانوں سے مختلف ہے، یہ صرف کہانی ہے، داستان نہیں ہے۔

اس کہانی میں قصہ پن ہے، اس کے کردار معاشرتی الجھنوں کی علامت نہیں ہیں، اس کا مقصد نہ اصلاح ہے اور نہ معاشرہ پر تنقید، اس طرح یہ کہانی ناول سے مختلف ہے، اور صرف کہانی ہے، ناول نہیں ہے۔

البتہ یک نظری عشق، خفیہ ملاقاتیں، اعزہ کی مسلح یورش، وصل بعد موت اور خانگی زندگی کے مشرقی آداب، مجبوریاں اور جرأتیں، جو اس مختصر کہانی میں ملتی ہیں، انیسویں صدی کے اواخر میں لکھے ہوئے اردو ناولوں میں مشترک ہیں، انگریزی ناول نے نیا شعور بخشا، نئی بلندیاں اور نئی پستیاں دکھائیں، مگر مشرقی تصور عشق اور خانگی زندگی کے آداب کو ابتدا میں نہیں بدلا، جذب عشق سے جو برگشتہ ہوکر انیسویں صدی کے ناولوں میں بغیر عزم و ارادے کے داخل ہوا، جو تاریخ کا نظری عمل تھا، آج بھی مجبوری عشق اور وصل بعد موت میں زیادہ کشش محسوس کی جاتی ہے، جوہر فن نہیں ہوتا ہے، خارجی اثرات کے تحت قالب بدلتا رہا ہے۔

جذب عشق کی دوسری اہم خصوصیت اسکی زبان ہے، اسکے ذریعہ ۱۷۹۶ء میں لکھی ہوئی نثر کا یہ نمونہ ملتا ہے:-

"اور یہ بیدل مایوس وصال اس راہ سے ہوکر نکلنے کی امید پر ٹھیک دوپہر کو عین شدت گرمی میں بام خانہ پر جو بلندی میں طعنہ زن الوند تھا، ساتھ تینوں ہمدموں محرم کے چڑھ کر نگاہیں نا امید از کرنے لگی:"

نگاہیں لے رہی تھیں ذوق دیدار — زباں کو پر نہ تھا امکان گفتار
ہیا ننگ قوت منظر تھی — یہ تھی یاں اور نگہ اسکی ادھر تھی

اور بہ زبان حال مایوسانہ گویا تھا اس شعر کے تھی

کس کہوں آہ برائی نصیب کی — دل ملتے ہی فلک نے جدائی نصیب کی

بہرحال وہ دلآرام

نظر آنے سے معطل رہ گیا جب — ہوا وہ روز اس پر تیرہ جوں شب
گیا وہ بے وفا روپوش ہوکر — گری یہ خاک پر بے ہوش ہوکر

اس عرصے میں اتفاقات حسنہ سے ایک جوان خوش خو پاکیزہ رو جو عازم اس لشکر کا تھا کوٹھے کے نیچے سے ہوکر گذرا اور اچانک اوپر نگاہ کی کیا دیکھے کہ ایک تین عورتیں خورشید طلعت کھڑی کف افسوس ملتی ہیں حال خزاں مآل پر ایک رشک پری کے جو مانند تصویر خاک پر پڑی ہے، اشک بہاتی ہیں۔ (کذا)

چشمش آں گل آمد چوں یکے ماہ — نہ مہ خورشید آوج عزت و جاہ
محاق غم سے لیکن خوب ہی آہ — ہلال آسا ہوئی ہے گھٹ کے وہ ماہ

لڑائی کا منظر

"جب اس سر باختہ نے یہ رنگ دیکھا کہ یار مددگار گرفتار ان ناپاکوں کا ہوا نہایت شکستہ دل ہوکر اس خطرے سے کہ مبادا کہیں آپ بھی اسیر ہو جائے تیغ خوں آشام نیام سے لی اور مانند شیر گرسنہ کے جو رمنے گوسفندوں میں پڑے ہر ایک مقہور پر حملہ کیا جدھر ڈپٹ کر ہاتھ مارتا تھا وہ مدبر متفرق ہوکر کائی کے مانند پھٹ جاتے تھے،

ہر جا کہ بازو برافراختے — سر خصم بر پایش انداختے

اور جس کے سر پر اس کی تیغ آبدار لگتی تھی مانند تار کے صابون سے گذرتی اس برگشتہ بخت کو شکل خیار تر کی دونیم کرتی تھی، القصہ کہاں تک لکھوں

بہ ہر جا کہ شمشیر او کار کرد — یکے را دو کرد و دو را چار کرد

(از صبح نو پٹنہ ص ۱۱-۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ء)

یہ نثر نوطرز مرصع ۱۷۷۵ء اور باغ و بہار ۱۸۰۱ء کے درمیانی زمانے میں لکھی گئی تھی۔

اس میں نوطرز مرصع کی عربی و فارسی آمیز عبارت آرائی نہیں ہے، اور نہ باغ و بہار کی بامحاورہ زبان کا چٹخارہ ہے، بلکہ عام فہم نثر ہے جس کو رنگین اور دلچسپ بنایا گیا ہے، اس میں داستان طرازی

نہیں ہے، تصنع پن ہے، یہ اس زمانے کے تعلیم یافتہ شرفا کی گفتگو کا نمونہ ہے، اس کی خوبی اسکے بیساختہ پن میں پوشیدہ ہے، اردو نثر کے ارتقائی مطالعے میں یہ نمونہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

تحفۃ العجم | یہ ایک فارسی فرہنگ ہے، اس کی طباعت نہیں ہوئی، اس کا قلمی نسخہ (۱۸۴۷ء) حبیب گنج کلکشن مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہے (متفرقات فارسی نمبر شمار ۵/۱۳۱)۔ سنہ تصنیف ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۹ء) اور تعداد اوراق ۱۲۹ ہے،

خزینۃ الامثال | حقیقت نے یہ کتاب ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۱ء) میں لکھی تھی، خاتمہ کتاب میں درج ہے:

"بحمد اللہ کہ باوجود حوادث انگیزی ہاے فلک خلل انداز تفرقہ پرداز ایں بحر زخار و محیط ناپیدا کنار کہ بہ تخیل ساحلش عقل بالادست غواصان قلزم ہمہ دانی لطمہ خور پنجہ امواج حیرانیست بنا بر حسن نیت طالبان در ۱۲۱۵ھ یکہزار و دوصد و پانزدہ ہجری نبوی گرداب دار دگوہر کرد از یکجا و در یک صدف قرار گزید۔ الخ

حین اتممت ہذہ النسخۃ   مستعیناً بربی المتعال

سال تاریخ [illegible] ستم کر کہا   ہم زبانش عیاں بر اہل کمال

کر خزینی سے خرچ ساٹھ عدد   بولا ہاتف خزینۃ الامثال

خزینہ = ۶۷۲   ۶۷۲ - ۶۰ = ۶۱۲   الامثال = ۶۰۳   ۶۱۲ + ۶۰۳ = ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۱ء)

اس کتاب کی طباعت ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) میں مطبع مصطفائی لکھنؤ میں ہوئی،

حقیقت نے سبب تالیف میں تحریر کیا:

"مد حسین شاہ متخلص بہ حقیقت عفا اللہ تعالیٰ عن سیاتہ فی یوم القیامۃ صاحب سخن کی خدمت میں ملتمس ہے کہ ایک روز غریب خانے میں مجمع ان دوستان موافق اور یاران صادق کا مانند عقد پروین درپرن کے تھا، جو ہر ایک ان میں سے سخن فہمی و نکتہ شناسی بذلہ گوئی

و لطیفہ سنجی میں ضرب المثل اہل سخن کا تھا، سب بشکل بلبل نغمہ سرا و طوطی شکریں نوا کے چہچہے بھر رہے تھے، اور باہم چرچا ہر ایک فن کا اور تذکرہ شعر و سخن کا کر رہے تھے، اتفاقاً بر سبیل مذکور ذکر امثال کا درمیان آیا، سب یک زبان ہو کر بندے کو فرمایا کہ دفتر کے دفتر انواع علوم سے آراستہ ہیں اور اقسام فنون سے پیراستہ مگر ایسی کتاب جو مجمع امثال ہو نظر نہیں آئی اگر تو ہمارے پاس خاطر سے موافق اس مثل کے بیکار مباش کچھ کیا کر امثال پریشان کو جمع کرے تو خالی لطف اور فائدے سے نہ ہوگا، ہر چند بندہ اپنے تئیں مرد اس میدان کا نہ جانتا تھا لیکن دوستوں کے کہنے سے اس وادی پر خطر میں گامزن ہوا، اور بعونہ تعالیٰ بہت سی محنت اور مشقت کر کے ایک مدت مدید اور عرصہ بعید میں امثال عربی و فارسی اور ہندی کو زبان زد خواص و عوام کے تھیں۔ جمع کیں اور ہر مثل کو مواضع اور مواقع لائقہ میں مانند سبحہ لآلی کے منتظم اور منسلک کر کے موسوم بہ خزینۃ الامثال کیا" (ص ۴-۵)

کتاب کی ترتیب "گنجینہ" پر ہے، گنجینہ کو "خزینہ" پر تقسیم کیا گیا ہے، مثلاً گنجینہ اول در امثال عربیہ کے ذیل میں "خزینۃ الخزینات" امثال پر مشتمل ہے جو الف سے شروع ہوتی ہیں۔ عربی امثال کا ترجمۂ اردو مولوی تراب علی نے کیا ہے، جو اصل متن پر اضافہ ہے، عبد الرحمٰن شاکر مالک مطبع مصطفائی نے یہ ترجمہ اس وجہ سے شامل کتاب کیا تاکہ باسہل وجوہ ہر شخص کی سمجھ میں آئے۔

اس فن پر عربی و فارسی میں کتابیں ملتی ہیں، حقیقت نے عربی و فارسی امثال کے ساتھ ہندی امثال بھی شامل کر کے بڑا کام کیا ہے، ان میں بیشتر ہندی امثال اب بھی سننے میں آتی ہیں، بہت سی امثال میں تغیر واقع ہو چکا ہے، ایسی امثال بھی ہیں جنھیں نہ سنا ہے نہ پڑھا ہے، یہ کتاب اپنے فن میں بیش قیمت ہے،

چند ہندی امثال بطور نمونہ پیش ہیں:۔

"باپ نہ مارے پدڑی اور بیٹا تیر انداز۔ باپ نہ دادی مار خوادی۔ باپ کرے باپ کے آگے آئے بیٹا کرے بیٹی کے آگے آئے۔ باپ پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ بات کی بات خرافات کی خرافات۔ بکری کے سینگوں کو چرگئے بیری کے پات۔ بات رہ جاتی ہے وقت نہیں رہتا۔ بات پر بات یاد آئی۔ بات کہی اور پرائی ہوئی۔ بات پوچھے بات کا لچھن پوچھے۔ بات جو جا ہی آپنے تو پانی نہ مانگ پی۔ باتیں اگلی کریں خوا۔ بارہ برس پیچھے گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں۔ بارہ برس دلی میں رہے بھوبل نہیں دیا کرتے تھے۔ بھاڑ جھونکتے تھے۔ باڑھ ہی جب کھیت کو کھائے تو رکھوالی کون کرے بازار کی مٹھائی جس نے پائی تس نے کھائی۔ باسی بچے تو کتا کھائے۔ باسی کڑھی میں ابال آیا۔ باسی پھولوں باس نہیں پردیسی بالم تیری آس نہیں۔ باقی کا مارا گاؤں اور آگ کا مارا جو لھا۔ باگ بکری کو ایک جگہ پانی پلایا ہے۔ بال کی کھال کھینچتے ہیں۔ بال باندھا چور بال باندھے کوڑے مارتا ہے۔ باہمن سے دان مانگتے ہیں۔ بانجھ بجوگی شیطان کی لنگوٹی۔ بانجھ بیانی سونٹھ اڑانی۔ باندی کی آگی منہ گئی نہ آندھی۔ باہر کی کھا جائیں گھر کے گیت گائیں۔"

اس بات کی ضرورت ہے کہ خزینۃ الامثال سے ہندی امثال کو جمع کرکے نئی ترتیب اور صحت کے ساتھ ان کو طبع کیا جائے۔

تذکرۂ احبا: خزینۃ الامثال ۱۸۰۱ء اور مثنوی ہشت گلزار ۱۸۱۰ء کے درمیان حقیقت کی کوئی تصنیف نہیں ملتی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سفر دکن سے پہلے (۱۸۱۰ء) حقیقت کی تصنیفات نثر میں تھیں، اس لیے ۱۸۰۱ء اور ۱۸۱۰ء کے درمیانی زمانے میں انھوں نے ضرور کوئی کتاب لکھی ہوگی، میری دانست میں وہ کتاب تذکرۂ احبا تھی۔

تذکرۂ احبا تو نہیں مل سکا، البتہ میرے مکرم جناب امتیاز علی صاحب عرشی نے یہ امر طے کر دیا ہے کہ اس تذکرے کے مولف حسین شاہ حقیقت تھے، بعد کو تذکرہ خوش معرکہ زیبا سے بھی اسکی تصدیق ہوگئی کہ حقیقت کے تذکرہ کا نام تذکرۂ احبا ہے۔ (سہ ماہی اردو، ص ۱۰، اپریل ۱۹۶۷ء)

اپنے مقالے میں عرشی صاحب نے محسن علی کے ترجمہ مخزن نکات کا یہ جملہ نقل کیا ہے "اس واسطے اس زمانے کے شعرا کو اس طبقہ سیوم میں ترجمہ تذکرہ احبا سے راقم لکھتا ہے کہ اہل تمیز ذوق کلام کو دریافت کریں اور حال اور اشعار ہر شاعر کا زیادہ کر دیا ہے کہ ناظرین کا موجب مسرت ہو" (اردو، ص ۵-۶ اپریل ۱۹۶۷ء)۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں، اول یہ کہ تذکرہ احبا فارسی زبان میں لکھا گیا تھا، دوم یہ کہ وہ ان شعرا پر مشتمل تھا جنھیں حقیقت نے دیکھا تھا، یا جن کا تعلق ماضی قریب سے تھا، شاید اسی مناسبت سے حقیقت نے تذکرہ احبا نام رکھا تھا۔

چونکہ تذکرہ احبا مجھے یا عرشی صاحب کو نہیں مل سکا ہے، اس لیے اس کی اہمیت پر گفتگو نہیں کی جا سکتی، البتہ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حقیقت نے اپنے معاصرین کے حالات و اشعار کو اسی دیدہ ریزی سے لکھا ہوگا جو ان کی نثری کتب میں ملتی ہے۔

مثنوی ہشت گلزار: حقیقت نے یہ مثنوی ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں لکھی تھی۔

نامہ نامی جب ہوا یہ طے
سن تھی پچیس اور بارہ سے

اس کی طباعت ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (۱۰ اکتوبر ۱۸۵۱ء) کو بیت السلطنت لکھنؤ میں ہوئی، خاتمۃ الکتاب پر تحریر ہے "محمد مصطفیٰ خاں خلف حاجی محمد روشن خاں مرحوم در بیت السلطنت لکھنؤ محلہ محمود نگر زیر اکبری دروازہ بتاریخ پانزدہم شہر ذیحجہ ۱۲۶۷ھ بقالب طبع آوردہ۔" حقیقت نے لکھا ہے کہ مثنوی میں اشعار کی تعداد ۴۷۶۵ ہے

شعر اتنے ہوئے کیا جو شمار
سات سو پہ سٹھ اور چار ہزار

اور اس کا تکملہ تین ماہ چند یوم میں ہوا۔

اس طرح سے بعرصہ سہ ماہ   مثنوی میں نے یہ لکھی ہے آہ

بیس ۲۰ دن سے فزوں نہیں ہوتے   بلکہ کم اس سے ہیں کہیں ہوتے

حقیقت کے حالات میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ وہ مثنوی کی تالیف کے وقت بہت پریشان تھے، انھوں نے اسی مثنوی کے ذریعہ نواب عبد القادر خاں بہادر ثابت جنگ ابن نواب والاجاہ مرحوم والی کرناٹک سے تقرب حاصل کیا تھا، جس سے ان کی پریشانیوں میں تخفیف ہوگئی تھی، نواب ثابت جنگ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے،

ختم ہیں اس پہ خوبیاں بالکل   ہے وہ باغ جہاں میں غیرت گل

بخشش اسکی بیان سے ہے باہر   بلکہ وہم و گماں سے ہے باہر

شعر تو لعل و دُر سے بہتر ہے   کب وہ لعل و گہر برابر ہے

بس یہ تیرے تئیں وسیلہ ہے   واں یہ جانے کا روز حیلہ ہے

تب تو رکھکر دوات اٹھا کے قلم   یہ کیا قصۂ بدیع رقم

نعلبند اس چمن کا جب میں ہوا   ہشت گلزار اس کا نام رکھا

ہشت گلزار سے پہلے قصہ بہرام گور و حسن بانو مقبول تھا، اور اس پر مشتمل فارسی و دکنی میں مثنویات موجود تھیں، فارسی میں بہرام و گل اندام، ہفت پیکر، ہفت منظر، بہرام و حسن بانو ملتی تھیں، جن میں نظامی کی ہفت پیکر زیادہ معروف تھی، دکنی اردو میں اس قصے کو عادل شاہی عہد کے شاعر امین کمال گجراتی نے لکھنا شروع کیا اور دولت نے ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں مکمل کیا (اردوئے قدیم ص ۱۸)۔ اس کے بعد طبعی نے ۱۰۸۱ھ (۱۶۷۰ء) میں اس قصے کو نظامی کی ہفت پیکر سے اخذ کرکے نظم کیا (اردوئے قدیم ص ۷۰-۷۱)۔ ملک خوشنود نے یہی قصہ خسرو کی

ہشت بہشت سے ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں نظم کیا (اردوئے قدیم ص ۸۳) حیدر بخش حیدری نے ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میں ہفت پیکر کا منظوم ترجمہ کیا۔ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں حقیقت کی ہشت گلزار تحریر ہوئی،

حقیقت نے لکھا ہے کہ ان کے پیش نظر خسرو کی ہشت بہشت تھی جس کا انھوں نے ترجمہ تو نہیں کیا مگر جدا طور پر نظم کیا ہے

ترجمہ اس کا میں نہیں کرتا   پر وہ قصہ کروں ہوں نظم جدا

فی الحقیقت کہوں ہوں میں اے دوست   یعنی وہ مغز اور ہے یہ پوست

ہے وہ لب لباب مغز سخن   خار بن ہے یہ اور وہ گلبن

رشتہ یہ اور وہ دُر شہوار   وہ گل تر ہے اور خشک یہ خار

ہشت گلزار کی تالیف کے وقت مثنوی سحر البیان غیر معمولی شہرت حاصل کر چکی تھی، حقیقت مثنوی سحر البیان کی خصوصیات اور شہرت سے ناواقف نہیں تھے۔ ہشت گلزار کی تالیف کے وقت اس کا ردعمل فطری تھا، انھوں نے سحر البیان کے مقابلے میں نہ تو کوئی نئی بنیاد رکھی اور نہ آرائش کے لیے نیا سامان فراہم کیا، بس یہ تاثر دیا کہ ہشت گلزار کے مقابلے میں سحر البیان پانی میں دھونے کے قابل ہوگئی ہے،

معنی تازہ ہیں لفظ بھی رنگیں   چوں گل نوبہار خلد بریں

ہے ہر اک لفظ غیرت گلزار   ہر سطر سے عیاں ہے سنبل زار

معنی یوں لفظ میں ہیں جلوہ گرا   ہو بھری جیسے شیشہ میں صہبا

ہاں حسن دہلوی اگر ہوتے   مثنوی اپنی پانی میں دھوتے

لن ترانی نہ کر حقیقت تو   اپنے منہ سے نہ بن میاں مٹھو

ہے نہیں منصفوں سے ڈر مجھکو — ہے تو ہٹ دھرموں سے خطر مجھکو
آج تک ان کو یہ نہیں معلوم — نثر ہے یہ کلام یا منظوم
مشک وہ ہے جو آپ بو دیوے — بوئے خوش خود وہ سو بسو دیوے
دعوی شاعری نہیں مجھکو — نسبت اس سے ذری نہیں مجھکو
ہے یہ فیضان حضرتِ جرأت — ورنہ کیا شعر سے مجھے نسبت

ہشت گلزار کو سرو قدی تو ملی، مگر حسن چمن بندی سے محروم رہی، اس کی معاشرتی جھلکیاں، رسوم کے بیانات، جذبات نگاری اور منظر کشی مثنوی سحر البیان کے فن کی اس بلندی کو نہیں پاتے جو حسن باؤں کی مربوط یکجائی کا نتیجہ ہوتی ہے،

ہشت گلزار کی زبان میں سادگی و روانی ہے۔ متروک الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے، نامانوس الفاظ بھی استعمال نہیں کیے گئے ہیں۔ انداز نثر کا سا ہے، جس سے شدت اثر میں کمی ہوگئی ہے، یہ مثنوی اس زمانے کی زبان کا بہتر نمونہ ہے۔ سحر البیان کے بعد اسکے زیر اثر وجود میں آنے والی مثنویات میں، اس کا نام بلاشبہ سر فہرست ہی لکھنا ہوگا۔

بطور نمونہ چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:-

کوئی پھبتی کسے یہ کچھ بولے — اور جگت پر زبان کو کھولے
باندھ کر اک دو شالے کی گاتی — گاتی پھرتی وہ گات دکھلاتی
کوئی مستی لگا کے کھاوے پان — خون عاشق کرے بہر عنوان
کہے خندی کسی کو کوئی .... — اور برا مانے کوئی جاوے ٹال
ان کا کب تک کیا کروں میں بیاں — الغرض تھی ہر اک آفتِ جاں
مستعد پینے اور پلانے میں — مشتغل تھی گزک کے کھانے میں

کرکے نعمان نے سب یہ تیاری — آیا بہرام پاس یکباری
دست بستہ ہو عرض حال کیا — مژدہ جانفزا سنا یہ دیا...
آئی جب روبرو وہ مہ پارہ — ہوگئی بند چشم نظارہ
ایک غمزے سے اور بہ نیم نظر — زہد و ایمان و دیں کی غارتگر
بت غارتگر شکیب و قرار — اس سے کرنا حذر ہی ہو درکار
دیکھ بہرام کو وہ عشوہ فروش — ہو کے ناز و نیاز کے ہمدوش
دیکھ ان کافروں کے طرز سلام — کر کے مجرا کھسک چلا آرام
سر پہ عالم کے ہو ترا سایہ — آسماں سا بلند ہو پایہ
لا کے پھر کشتیاں پُر از گوہر — کیں نثار اتنی شاہ کے سر پر
بادشاہ نے بھی لطف شاہی سے — بوسے ہر ایک کی جبیں پہ دے
تخت شاہی پہ جلوہ فرما ہو — سامنے کو بٹھا وہ ساتوں کو
تھا حریفان نو سے دور آرام — ساتھ ساتوں کے چل رہا تھا جام

حقیقت نے چارلس پیرون (جنرل پیرون ملازم سندھیا) کی فرمائش پر خسرو کی ہشت بہشت کو اردو کا بھی جامہ پہنایا تھا، یہ ترجمہ ۱۲۱۱ھ یا ۱۲۱۵ھ میں ہوا،

(صحیفہ لاہور ص ۲۶ جنوری ۱۹۶۴ء)

مثنوی ہیرامن طوطا یہ مثنوی ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء، ۱۸۵۲ء) میں کائستہ پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی "قصہ دلپذیر مطبوع" (۱۲۶۸ھ) سے سنہ طباعت برآمد ہوتا ہے۔

یہ مثنوی حقیقت کے زمانہ آخر کی تصنیف ہے، اس وقت وہ لکھنؤ میں تھے، انھوں نے جس طرح مثنوی ہشت گلزار نواب عبد القادر خاں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے لکھی تھی

اسی طرح یہ مثنوی مرزا عنایت علی بیگ مہتمم مطبع مصطفائی کو پیش کرنے کے لیے لکھی تھی، ہشت گلزار اور ہیرا من طوطا کے وہ اشعار یکساں ہیں جو سبب تالیف کے ذیل میں درج ہوئے، ضرورتاً کہیں کہیں تبدیلی کی ہے، مثلاً ہشت گلزار کا یہ شعر ؎

دیکھا پھر آکے ملک کرناٹک   کہتے دکھن کا ہیں جسے پھاٹک

ہیرا من طوطا میں یوں درج ہوا ؎

دیکھا پھر آکے لکھنؤ جس آں   کہتے ہیں ہند کی جسے سب جاں

پھر وہ لکھتے ہیں ؎

کس لیے اس قدر ہراساں ہو   ارے تیرا ہر ایک خواہاں ہے
مصطفائی دوکاں تک تو جا   واں پہ ہیں ایک قدرداں مرزا
ہے عنایت علی کا نام اُن کا   لطف احسان ہی ہے کام اُن کا
تجھ کو جس وقت دیکھ پائیں گے   رائے عمدہ کوئی بتائیں گے
اے حقیقتؔ تو ان کے پاس تو جا   لیتا جا کوئی عمدہ سا قصا

یہ عشقیہ قصہ نہیں ہے، اس کی بنیاد قالب بدلنے کا علم ہے جو یوگ سے متعلق ہے، اور جس سے قدیم سنیاسی واقف تھے، کہانی اس طرح ہے: بادشاہ ایک سیاح سے کایا پلٹ کا علم سیکھتا ہے جو وہ وزیر کو بھی سکھا دیتا ہے، ایک موقع پر بادشاہ ہرن کا شکار کرتا ہے، وزیر ہرن کے قالب میں بادشاہ کو منتقل کر کے تخت پر قبضہ کر لیتا ہے، کچھ دن بعد بادشاہ ہرن کا قالب چھوڑ کر ایک مردہ طوطے کے (ہیرا من) قالب میں چلا جاتا ہے، طوطا ایک صیاد کے جال میں پھنس کر مہاجن بچے کے ہاتھ فروخت ہوتا ہے، جس کو بالآخر بادشاہ زادی خرید لیتی ہے، طوطا بادشاہ زادی کو تمام قصہ سناتا ہے،

وہ سمجھ جاتی ہے کہ طوطے کے قالب میں اس کا باپ ہے۔ ایک دن وزیر جو بادشاہ بن گیا تھا، شاہزادی کے گھر آتا ہے، اور اس کو کایا پلٹ دکھانے کے لیے خود کو مرغ میں منتقل کر لیتا ہے، شاہزادی مرغ کو ذبح کر دیتی ہے۔ اور بادشاہ طوطے کے قالب سے اپنے اصل قالب میں آجاتا ہے،

اس قصے کا ماخذ کوئی پرانی کہانی ہے جو حقیقتؔ نے دکن میں پڑھی یا سنی تھی، دکنی مثنویات میں فخر الدین نظامی (نویں صدی ہجری) کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا قصہ مثنوی ہیرا من طوطا کے قصہ سے مشابہ ہے۔ اس سلسلے میں سخاوت مرزا نے لکھا ہے "البتہ متاخرین میں شاہ حسین حقیقتؔ لکھنوی ثم مدراسی کی ایک مثنوی ہیرا من طوطا تصنیف ۱۲۶۸ھ میری نظر سے گذری جو کائستھ پریس سے باتصویر شائع ہوئی تھی، کدم راؤ کا قصہ اس سے ملتا جلتا ہے،" (اردو ادب علی گڑھ ص ۵۴، شمارہ ۲، ۱۹۶۶ء)

تاہم یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ فخر الدین نظامی کی مثنوی سے ہیرا من طوطا کا قصہ مستعار ہے۔

مثنویات کدم راؤ پدم راؤ اور ہیرا من طوطا کا قصہ کتھا سرت ساگر اور بیتال پچیسی کی اس کہانی سے مشابہ ہے جس میں برہمن راجہ نند کے قالب میں داخل ہو کر راج کرنے لگتا ہے، یوں بھی قالب بدلنا، راج پر غاصبانہ قبضہ کرنا اور حیوانی کرداروں کا انسانی عقل و فراست سے کام لینا سنسکرت کہانیوں کے تصورات ہیں، حقیقتؔ نے کتھا سرت ساگر اور بیتال پچیسی کی کہانی کو اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے، اس سے یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ہیرا من طوطا کی کہانی قدیم کہانی سے مشابہ ہونے کے باوجود حقیقتؔ کے ذہن کی پیداوار ہے، اور انھوں نے کسی کہانی یا مثنوی سے استفادہ نہیں کیا، بلکہ مشہور العوام فسانے کو اپنے طور پر مرتب کر کے مثنوی لکھ دی۔

مثنوی ہیرا من طوطا میں جذبات عشق کی چاشنی کے بغیر قصہ پن ہے، وہ عام فہم زبان میں بیانیہ شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔

ہے سنا یوں بملک ہندوستاں ۔ ایک فرمانروا تھا عالی شاں
تھے شہاں جہاں مطیع اس کے ۔ ہم زمیں ہم زماں مطیع اس کے
باج خواہوں سے تھا وہ لیتا باج ۔ تاج دیتا انھیں جو تھے محتاج
بسکہ کرتا تھا وہ عدل و داد ۔ تھی سپاہ اور رعیت شاد
ڈر مخالف کا نا عدو کا خطر ۔ تابع امراس کے فتح و ظفر.....
اس نے چاہا کہ ہنس کے دیوے ٹال ۔ دے ہنسی کے تئیں ہنسی میں ڈال
کوئی حیلہ نہ جب چلا اس کا ۔ ہو کے مجبور تب وہ یوں بولا
مجکو بھی شاہ کی طرح ہر آں ۔ تھی تلاش نوادرات جہاں
ناگہاں ایک مل گیا استاد ۔ علم کا یا پلٹ کا تھا اسے یاد.....
عرض کی اس نے اس سے کیا بہتر ۔ دیکھ لے اے شہ ہنر پرور
کر کے بیجاں دوں ہی ایک مکھی ۔ نقل روح اسکے کالبد میں کی
ہو کے مردہ زمین پہ یہ گرا ۔ آئی پرواز میں مگس بہوا
تن بیجاں میں جان جب آئی ۔ دیکھ حیرت یہ شاہ کو آئی
بولا گر تو مجھے یہ سکھلا دے ۔ جس قدر چاہے ملک و زر لیلے.....

(بشکریہ جناب سخاوت مرزا۔ از مکتوب گرامی مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۶۷ء)

شاید یہ مثنوی مرزا عنایت علی بیگ کے اہتمام سے ہی سنہ ۱۲۸۰ھ میں کائستھ پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی جیسا کہ خاتمہ کتاب پر مادہ تاریخ "نقش دلپذیر مطبوع ہوا" سنہ ۱۲۸۰ھ (سنہ ۱۸۶۳ء ۔ سنہ ۱۸۶۴ء)

معلوم ہوتا ہے۔

ہفت نسخہ اس کتاب کا حوالہ سعادت خاں ناصر نے تذکرۂ خوش معرکہ زیبا میں دیا ہے۔
(صحیفہ لاہور، ص ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۶۸ء)

دیوان حقیقت کے دیوان کا قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے، اس کا سائز ۸½ × ۶ - تعداد صفحات ۹۸ اور سطور ۱۱ ہیں، وہ فرد، غزل، مربع، مستزاد، رباعی، خمسہ، مثلث، قطعہ وغیرہ اقسام شعر پر مشتمل ہے، مگر نامکمل ہے، کیونکہ متعدد اشعار جو تذکروں میں ملتے ہیں، اس میں نہیں ہیں، کوئی ترقیمہ بھی نہیں ہے، جس سے سنہ کتابت اور کاتب کے نام کا علم ہو سکے، (قومی زبان ص ۱۴۱-۱۴۲ یکم فروری سنہ ۱۹۶۳ء)

مجھے دیوان کا نہایت مختصر انتخاب جناب شفق خواجہ کی عنایت سے مل گیا، تھوڑے بہت اشعار تذکروں میں بھی مل جاتے ہیں، دونوں کا انتخاب ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

میری آنکھوں کے مقابل سے جو محبوب گیا ۔ اسقدر اشک بہے آہ کہ جی ڈوب گیا

لاجواب اس نے مجھے ایک نظارے میں کیا ۔ عرض مطلب اس سے جب میں نے اشارے میں کیا

ثابت اب جوش جنوں میں کب ہے پیراہن مرا ۔ رفتہ رفتہ کر دیا وحشت نے عریاں تن مرا
چھپایا تم نے منہ ایسا کہ بس جی ہی جلا ڈالا ۔ تغافل نے تمھارے خاک میں ہم کو ملا ڈالا

غم عشق دل کو جلائے گیا ۔ اک آتش سی تن میں لگائے گیا
حقیقت وہ کھینچے جدھر تیغ تھا ۔ ادھر میں بھی سر کو جھکائے گیا

کیا تو نے عشق میں لے عزم جو ہاتھ لگا ۔ زیست سے ہاتھ بھی دھویا پہ نہ تو ہاتھ لگا

دیکھا جو نہیں اس کو، اس کو جو نہیں دیکھا ۔ رقت ہے مجھے آتی، آتی ہے مجھے رقت
دیکھوں میں ذرا اسکو، اسکو میں ذرا دیکھوں ۔ طاقت یہ نہیں مجھ میں، مجھ میں یہ نہیں طاقت

ہم سے چرا کے آج نظر تم چلے کدھر ۔۔۔ کرتے ہیں ہم جہاں سے سفر تم چلے کدھر

جاتے ہو کس طرف کو ارادہ کدھر کا ہے ۔۔۔ کچھ تو کہو کہ باندھ کمر تم چلے کدھر

جانے کا قصد خانۂ دل سے جو کرتے ہو ۔۔۔ جانا یہ اپنا چھوڑ کے گھر تم چلے کدھر

دونوں جہاں کو میری آنکھوں میں یک بیک ۔۔۔ تاریک کر کے رشکِ قمر تم چلے کدھر

پڑا اک ایسا صدمہ مجھ حزیں پہ ۔۔۔ جو میں یوں تلملاتا ہوں زمیں پہ

تلطف اور ترحم غیر پر ہے ۔۔۔ ستم جور و جفا ہیں ایک ہمیں پہ

کٹی شب رات تارے ہی گنتے ۔۔۔ ہوا دل مبتلا کس مہ جبیں پہ

ہجر میں کیوں نہ کروں یاد ملاقات اسکی ۔۔۔ کہ بہلتا ہے ذرا وصل کی تقریر سے دل

سخت اس کا ہے تعجب کہ حقیقت اسکا ۔۔۔ نرم ہو جائے مری آہ کی تاثیر سے دل

سوچ رہ رہ کے یہی کرتے ہیں اب ہر بار ہم ۔۔۔ وہ عیادت کو نہ آیا کیوں ہوئے بیمار ہم

ہم کو سمجھانے میں ہے ساقی گلفام سے کام ۔۔۔ نہ غرض بادہ و مینا سے نہ کچھ جام سے کام

جاتے ہو تو یہ داغ بھی دل کا مٹاتے جاؤ ۔۔۔ اب اپنا چھوڑ کر یہ نشاں تم چلے کہاں

کس کے ہیں انتظار میں آنکھیں ۔۔۔ جو کھلی ہیں مزار میں آنکھیں

وہ نہ آیا تو روتے روتے آہ ۔۔۔ آ گئیں ہجر یار میں آنکھیں

نہ خفا ہو جو تک رہوں پیارے ۔۔۔ کہ نہیں اختیار میں آنکھیں

میکشی کا نہ تم کرو اخفا ۔۔۔ سرخ ہیں خمار میں آنکھیں

کڑھایا مجھے اور رلایا مجھے ۔۔۔ غرض خوب اس نے ستایا مجھے

مرے گھر میں تشریف لائے جو تم ۔۔۔ یہ اللہ نے دن دکھایا مجھے

عجب وقت پر اس کا آنا ہوا ہے ۔۔۔ کہ جاں تن سے جس دم روانا ہوا ہے

ادھر کس مسیحا کا آنا ہوا ہے ۔۔۔ دل ناتواں کیا توانا ہوا ہے

نہ وہ رسم الفت نہ مہر و وفا ہے ۔۔۔ عجب طور پر کچھ زمانہ ہوا ہے

دوستو یاں اس بتِ کافر کو لایا ہے خدا ۔۔۔ ورنہ کب آتا وہ اپنی آہ کی تاثیر سے

خداوندا ملا اس جان جاں سے ۔۔۔ چلا جی ورنہ جسم ناتواں سے

مرا ہمدرد دکھا مجھکو زمیں پر ۔۔۔ فلک خوش رہ تو ماہ آسماں سے

زلف میں پھنس کے مرغ دل بولا ۔۔۔ چھوٹنا مشکل ایسے دام سے ہے

نام لینا ہی جب ترا چھوڑا ۔۔۔ کام کیا نامہ و پیام سے ہے

دلا اب دونوں مل کاٹیں گے اوقات آہ و زاری میں ۔۔۔ ہوئے بیمار ہم بھی لے تری تیمار داری میں

ان اشعار میں کشش و جاذبیت کی کمی محسوس ہوتی ہے، شاید حقیقت کا المیہ یہ تھا کہ وہ جرأت کے شاگرد ہوئے، جس سے ان کا علم و فضل، انکی اعلیٰ صلاحیتیں اور انکی خاندانی ادبی روایات غزلگوئی میں ابھرنے سے رہ گئیں، ورنہ انکی مثنویات، جو جرأت کی اصلاح سے بے نیاز ہیں، ان سے ان کے ادبی کمال کا اندازہ ہوتا ہے، زیادہ تعجب اس پر ہے کہ ان کی غزلوں میں تخیل کی رفعت، الفاظ کی صنعت اور تصوف کی رنگت بھی نہیں ہے، حالانکہ ہمارے اساتذہ قدیم ان سے خوب واقف تھے اور ان کے سہارے نیم جاں غزل کو بھی بار لیجاتے تھے، ان کی غزل میں جوان جسم کی حرارت بھی نہیں ہے، حالانکہ ایک کور چشم کے تصور نے اس حرارت کو اشعار میں سمو لیا تھا اور لذت لب و دہان کو پا لیا تھا، مگر حقیقت جرأت کے تلمذ اور مشق و مہارت کے باوجود اس حرارت سے بھی محروم رہے، اس لیے ان کی غزل نیم جاں ہے۔

حقیقت بزم شاعری میں ایک مثنوی نگار کی حیثیت سے زیادہ ممتاز ہیں اور اردو شاعری کی تاریخ انھیں مثنوی نگار کی حیثیت سے ہی یاد رکھے گی، ان کی دوسری تصانیف انکی ہمہ دانی

کا ثبوت فراہم کرتی ہیں جن سے اردو ادب کی تاریخ میں وہ ایک بھاری بھر کم اور باوقعت فرد نظر آتے ہیں۔

حوالجات

کتاب	مصنف	ناشر	سنہ
تذکرۂ ہندی	غلام ہمدانی مصحفی	انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد	۱۹۳۳ء
مجموعۂ نغز	قدرت اللہ قاسم	کریمی پریس لاہور	״
سخن شعراء	عبدالغفور خاں نساخ	نولکشور پریس لکھنؤ	۱۸۷۴ء
گلشن بیخار	غلام مصطفی خاں شیفتہ	نفیس اکیڈمی کراچی	۱۹۶۳ء
بزم سخن	سید علی حسن خاں	مطبع مفید عام آگرہ	۱۸۸۱ء
خمخانۂ جاوید جلد ۲	لالہ سری رام	امپیریل بک ڈپو پریس دہلی	۱۹۱۱ء
سراپا سخن (قلمی)	میر محسن علی محسن	رضا لائبریری رامپور	
تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	نولکشور پریس لکھنؤ	۱۹۳۴ء
تاریخ ادب اردو	محی الدین قادری زور	ادارۂ ادبیات اردو	۱۹۵۳ء
اردو کی نثری داستانیں	گیان چند	انجمن ترقی اردو کراچی	۱۹۵۴ء
اردوئے قدیم	حکیم شمس اللہ قادری	نولکشور پریس لکھنؤ	۱۹۳۰ء
اخبار الصنادید جلد اول	حکیم نجم الغنی		۱۹۱۸ء
حیات حافظ رحمت خاں	الطاف علی بریلوی	نظامی پریس بدایوں	۱۹۳۳ء
اردو میں ناول نگاری کا آغاز (مقالہ)	اقتدار عالم خاں	ماہنامہ نقوش لاہور	ستمبر ۱۹۶۵ء
دیوان حقیقت (گنجہائے گرانمایہ)	افسر امروہوی	ماہنامہ قومی زبان کراچی	فروری ۱۹۶۳ء
محسن کا ترجمہ مخزن نکات (مقالہ)	امتیاز علی خاں عرشی	سہ ماہی اردو کراچی	اپریل ۱۹۶۷ء

کتاب	مصنف	ناشر	سنہ	کیفیت
مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (مقالہ)	سخاوت مرزا	اردو ادب علی گڑھ شمارہ ۲	۱۹۶۶ء	
جذب عشق اور حسین شاہ حقیقت (مقالہ)	نیر مسعود	ماہنامہ صبح نو پٹنہ	ستمبر ۱۹۶۵ء	
مثنوی ہشت گلزار	حسین شاہ حقیقت	بیت السلطنت لکھنؤ	۱۸۵۰ء	یہ اڈیشن رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ اس سے میں نے استفادہ کیا ہے
صنم کدۂ چین	״	مطبع محمدی لکھنؤ	۱۸۴۷ء	
خزینۃ الامثال	״	مطبع مصطفائی ״	۱۸۵۴ء	
مثنوی ہیرامن طوطا	״	کاشتہ پریس ״	۱۸۵۱ء	یہ اڈیشن انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے، جناب سخاوت مرزا کی عنایت سے ضروری معلومات و انتخاب کلام موصول ہوا
دیوان حقیقت (قلمی)	״	انجمن ترقی اردو کراچی		جناب مشفق خواجہ نے انتخاب غزلیات بھیجنے کا انتظام کیا، دیوان انجمن کے کتب خانۂ خاص میں محفوظ ہے۔
نشتر	منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی	قومی پریس دہلی	۱۸۹۴ء	
محسن لکھنوی اور تذکرہ سراپا سخن (مقالہ)	ڈاکٹر اقتدا حسن	سہ ماہی صحیفہ لاہور	جنوری ۱۹۶۷ء	

تصحیح واستدراک

از مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی

جولائی ۱۹۶۸ء کے پرچہ میں نزہۃ الخواطر جلد ہشتم پر جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں بعض غلطیاں رہ گئی تھیں، ناظرین اس کی تصحیح فرمالیں۔

صحیح	غلط
	(معارف جولائی ۱۹۶۸ء ص ۴۴ سطر ۱۱)
یہ سلسلہ پانچویں جلد تک جاری رہا، جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی، اب ہندوستان کے حالات بدل چکے تھے، دائرۃ المعارف کو مجبوراً اس مفید سلسلہ کو بند کر دینا پڑا۔	اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں تیسرا حصہ شائع ہوا۔ اب ہندوستان کے حالات بدل چکے تھے، دولت آصفیہ کا جس کی سرپرستی میں یہ اور ایسے بہت سے عظیم الشان علمی کام انجام پارہے تھے، خاتمہ ہوچکا تھا، دوسرے کاموں کے ساتھ یہ سلسلہ بھی رک گیا۔
	(ایضاً ص ۵۴ سطر ۴)
اور ۱۹۵۷ء میں اس کا چھٹا حصہ حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی اعانت سے دائرۃ المعارف کی جانب سے شائع ہوا، پھر ۱۹۵۹ء میں اس کا ساتواں حصہ شائع ہوا۔	اور ۱۹۵۴ء میں اس کا چوتھا حصہ شائع ہوا، پھر یکے بعد دیگرے اس کے حصے شائع ہوتے رہے، یہاں تک کہ ۱۹۵۹ء میں اسکا ساتواں حصہ شائع ہوا۔

مطبوعات جدیدہ

سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ:- مرتبہ مولانا محمد ثانی حسنی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۸۰۳، مجلد مع رنگین گردپوش، قیمت عہ/
ناشر مکتبۂ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ۔

شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسفؒ کی وفات کے بعد ان کی تقریروں کے جو مجموعے اور رسالوں کے خاص نمبر شائع ہوئے تھے، اُن میں ضمناً ان کے حالات و سوانح بھی آگئے تھے، جو ناکافی تھے، اس لیے ایک مکمل اور جامع سوانحعمری کی ضرورت باقی تھی، اس کام کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تربیت یافتہ اور انکے بھانجے نے جو خود بھی تبلیغی جماعت کے پرجوش کارکن اور مولانا محمد یوسفؒ سے بھی عقیدت کا تعلق رکھتے ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی کی نگرانی میں انجام دیا ہے، یہ ضخیم سوانحعمری اٹھارہ ابواب میں ولادت سے وفات تک کے جملہ حالات پر مشتمل ہے، شروع میں مولانا کے خاندانی حالات اور خاندان کے متعدد علماء و مشائخ کا تذکرہ ہے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے حالات مولانا ابوالحسن علی کے قلم سے اور مولانا محمد الیاسؒ کے حالات ان کی کتاب سے ماخوذ ہیں، چند ابواب میں ہندوستان، پاکستان، عرب، افریشیائی اور مغربی ممالک میں تبلیغی جماعت کے کارناموں اور اس کے اثرات کا ذکر اور مولانا کی غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں، ان کی مشغولیتوں اور کثرت کار کی تفصیل ہے، آخری باب میں انکی ایک طویل ایمان افروز اور اثر انگیز دعا مذکور ہے، مولاناؒ فنا فی التبلیغ تھے، ان کا اوڑھنا بچھونا تبلیغ تھا اس لیے ان کی سوانحعمری میں قدرۃً ان کے دور کے تبلیغی کاموں کی پوری تاریخ آگئی ہے، خطوط وغیرہ کے

طویل اقتباسات سے اگرچہ کتاب کا حجم بڑھ گیا ہے، لیکن یہ خطوط بھی تبلیغی نقطۂ نظر سے مفید ہیں، کتاب بڑی محنت سے مرتب کی گئی ہے، اس سے مولانا کے ایمانی و اخلاقی اور علمی و دینی کمالات، تبلیغی جماعت اور دعوت و اصلاح کے اصولوں کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے، شروع میں مولانا ابوالحسن علی کے شگفتہ و اثر آفریں قلم سے ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد:۔ مرتبہ جناب عابد رضا بیدار صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۹۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت عنتہ پتہ انسٹی ٹیوٹ آف اورنٹیل اسٹڈیز رام پور۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس میں رطب و یابس سب شامل ہے، اب اردو کے صاحب قلم جناب عابد رضا بیدار نے یہ کتاب لکھی ہے، اس میں انھوں نے مولانا کی تحریروں کے آئینہ میں ان کی دلچسپ و متضاد شخصیت و افکار اور حالات و کمالات کا جائزہ لیا ہے، شخصیت و سوانح کا حصہ مختصر مگر جامع ہے اور مذہبی و سیاسی افکار کی داستان ادھوری ہے، صحافت و تصنیفات کے زیر عنوان مولانا کی مختصر و مطول اور اہم و غیر اہم تمام کتابوں اور ان کی ادارت میں نکلنے والے اخبارات و رسائل کے علاوہ ایک ایک مضمون و مکتوب کا سراغ لگا کر انکے متعلق مفید و ضروری معلومات تحریر کیے ہیں، مولانا کی عظمت کے اعتراف کے باوجود مصنف نے بڑی حقیقت پسندی سے کام لیا ہے، اور مولانا کی تحریروں اور خیالات کے متعلق پوری آزادی سے رائے ظاہر کرتے ہوئے انکی خامیوں اور غلطیوں کی بھی نشاندہی کی ہے، گو ان میں سے بعض باتیں قابل بحث ہو سکتی ہیں لیکن مصنف کے انصاف و دیانت میں شک نہیں کیا جا سکتا، انھوں نے مواد و معلومات کی فراہمی میں پوری چھان بین سے کام لیا ہے اور یہ کتاب خصوصیت سے مولانا کی صحافت و تصنیفات کے متعلق مستند و محققانہ معلومات پر مشتمل ہے اور اس سے ابوالکلامیات میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے، لیکن اس کی قیمت زیادہ ہے۔

نقوش راہ:۔ مترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب سبحانی اصلاحی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۱۲ قیمت مجلد للعہ پیسے وغیر مجلد ۳/۳۰ پیسے۔ پتہ: ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڈھ۔

مصر کی مشہور دینی جماعت الاخوان کے نامور زعیم و صاحب قلم سید قطب شہیدؒ کی آخری کتاب "معالم فی الطریق" کا یہ اردو ترجمہ ہے، مصنف نے اس کتاب میں حقیقی اسلام کو انسانیت کی موجودہ تباہی کا علاج بتایا ہے، اور قرآن و حدیث سے اسلام کی اصل تصویر، موجودہ باطل نظریات کے مقابلہ میں اس کا موقف اور مسلمانوں کے حقیقی اوصاف کی وضاحت اور داعیان حق کے لیے ضروری اور اہم امور کی نشاندہی کی ہے، اس ضمن میں عقیدۂ توحید کی اہمیت، اس کے بارہ میں انبیائے کرام کی شدت کے اسباب اور اس کے مسلم قومیت کا سنگ بنیاد ہونے کی وضاحت مثالوں سے کی ہے، جہاد کے دفاعی نہ ہونے اور دوسری تہذیبوں پر اسلامی تہذیب و کلچر کی برتری پر نہایت مفید بحث کی گئی ہے، اور مغرب زدہ مسلمانوں کی مرعوبیت اور قومی، وطنی اور نسلی تصورات پر تنقید ہے، مسلم معاشرہ کی تشکیل اور تنظیم و تحریک کی اہمیت، عقائد و عبادات کی طرح آئین و حکومت میں احکام الٰہی کی اہمیت ثابت کی گئی ہے، اور غیر الٰہی نظام اور باطل سے مصالحت و مداہنت کو کفر و جاہلیت قرار دیا گیا ہے، یہ معیار مسلم حکومتوں کے لیے تو بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن حالات و مصالح کو یکسر نظر انداز کر دینا یا غیر اسلامی حکومتوں میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے یہ معیار صحیح نہیں ہے، ان مباحث میں مصنف کا لب و لہجہ زیادہ تلخ ہو گیا ہے، جو مصر کے مخصوص حالات اور اخوان کی مظلومی کا نتیجہ ہے، ترجمہ شگفتہ مگر مقدمہ میں جذباتی انداز غالب ہے، اس کتاب میں ربط و ترتیب اور تصنیفی شان کی کمی ہے، لیکن یہ مصنف کے اسلام سے سچے عشق و محبت کا مرقع اور دعوت و اصلاح کا کام کرنے والوں کے لیے زریں ہدایت نامہ ہے۔

اذانِ سحر: - از جناب انور اعظمی مرحوم، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۴۴، مجلد قیمت مصر، پتہ انور اکیڈمی، سرائے میر، اعظم گڈھ۔

جناب انور اعظمی مرحوم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے لائق فرزند اور ہونہار شاعر تھے، لیکن افسوس شعلۂ مستعجل کی طرح ان کو زیادہ چمک دکھانے کا موقع نہیں ملا، ان کا ادبی و شعری ذوق بڑا پاکیزہ و ستھرا تھا، ان کے کلام کا مجموعہ "اذانِ سحر" کے نام سے انور اکیڈمی نے شائع کیا ہے، مرحوم کا دل اسلامی خیالات اور مسلمانوں کی سربلندی کے جذبات سے معمور ہے، وہ فکری حیثیت سے ڈاکٹر اقبال سے متاثر ہیں، لادینی افکار پر طنز و تبصرہ اور اسلام کے آفاقی پیغام کی ترجمانی کے علاوہ انھوں نے موجودہ دور کے ابتر حالات، ہندوستان اور عالم اسلام کے خوں فشاں واقعات اور مسلمانوں کی قدیم عظمت و شوکت پر پُر جوش اور ولولہ انگیز نظمیں کہی ہیں، لیکن عقیدت میں مرتب نے بعض معمولی درجہ کی نظمیں بھی شامل کرلی ہیں، کوثر اعظمی صاحب نے طویل اور قدرے مبالغہ آمیز مقدمہ میں شگفتگی کے ساتھ شاعر کے حالات و کمالات تحریر کیے ہیں، یہ مجموعہ فکری نظافت کے لحاظ سے اردو شاعری کے ذخیرہ میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

ہمارا دین حق: - مرتبہ مولوی ریحان الدین صاحب قاسمی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۶۰ قیمت ۶؍ پتہ کتب خانہ صدیقیہ، میرگنج، سلطانپور (یوپی)

اس کتابچہ میں لائق مصنف نے دین حق کی بنیاد یعنی کلمہ طیبہ کے دونوں اجزا توحید و رسالت کے متعلق اسلام کی صحیح تعلیمات پیش کر کے مسلمانوں کے مروج موجودہ غلط افکار و تصورات اور مشرکانہ اعمال کی تردید کی ہے، مصنف کا مقصد نیک، جذبہ قابل قدر اور انداز تحریر سادہ و عام فہم ہے، اس لیے عام مسلمانوں کے لیے یہ رسالہ مفید اور نفع بخش ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۲، ماہ جمادی الاخری ۱۳۸۸ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۸ء عدد ۳

مضامین